

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222955

UNIVERSAL
LIBRARY

فہرست مضامین



نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ربند را ناتھہ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف گیتان جی	ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم	۱۸۳
۲	فرانسیسی مجلس علمی کی تاریخ	مترجمہ مولوی سید وھاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج	۱۹۷
۳	جیت کی کنجی	مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب	۲۳۳
۴	ادبیات ایران در زبان مشروطہ	آقا رشید یاسمی مترجمہ مولوی سید وھاج الدین صاحب	۲۳۵
۵	خطبات گارساں دتاسی	مترجمہ جناب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن	۲۴۹
۶	نظام ہاشمی	مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	۲۶۵
۷	طوطا کہانی اور سب رس	س م ن	۲۶۷
۸	مجالس العشاق	حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب	۲۷۷
۹	تبصرے	مولوی عبدالعقی صاحب بی اے اڈیٹر	۲۸۳

ربندرا ناتھہ ٹیگور

کی شہرہ آفاق تصنیف

گیتان جلی

از

(ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم)

(۱)

جب ربندرا ناتھہ ٹیگور کی کتاب ” گیتان جلی “ (نیازِ نغمہ) شایع ہوئی میں انگلستان میں موجود تھا۔ جس طرح شورش و انقلاب کے بعد سیاسیات کے عالم میں ہر شے زیر و زبر ہو جاتی ہے ٹیگور کی آمد اور فتوحات نے قلمروئے سخن کو درہم برہم کر دیا تھا۔ ڈبلو۔ بی۔ بیٹس W.B. Yeats آئرلینڈ کے افسر الشعرا ارنسٹ ریس Ernest Rhys ویلز کے ادیب متعزم اور خود ملک الشعراے انگلستان اُن کو موجودہ زمانہ کی شاعری کا تاج پیش کر رہے تھے۔ کپلنگ Kipling نے تاب نہ لا کر ان تمام ہنگاموں سے دور خاموشی میں پناہ لے لی تھی۔ ایک شب ایک بزم شعرا میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک نوجوان شاعر نے جن کی ذات سے آئندہ انگریزوں کو بڑی اُمیدیں ہیں کہا ” جس دن سے ٹیگور کا کلام شایع ہوا ہے میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے اور اسی سوچ میں ہوں کہ آخر کیا کہوں “

اس کے بعد جب میں انگلستان سے الہانہ واپس آیا وہ عین وہ زمانہ تھا کہ ”نوبل انعام“ کو عطا ہوئے دس بارہ روز گذرے تھے۔ ٹیگور کا نام زبان زد تھا اور ہر کہ و مہ کے لب پر یہی تذکرہ تھا۔ علمی اور شاعرانہ دنیا میں کیا کیا چرچے تھے۔ ہفتہ بھر کے اندر گیتان جلی ترجمہ ہو کر شایع ہو گئی تھی اور مہینہ کے ختم تک ”باغبان“ اور ”ہلال“ کے تراجم کے طبع ہو جانے کا اشتہار تھا۔ ایک روز میں ایک دکان میں جہاں میں اکثر کتابیں خریدتا کرتا تھا داخل ہوا۔ دوکان دار نے اپنے خریداروں سے ازراہ فخر کہا ”یہ ٹیگور کے ہم وطن ہیں“ ہر طرف سے مجھ پر یورش ہونے لگی اور ”آپ کو اور ہندوستان کو مبارک ہو“ کی صداٹیں بلند ہوئیں۔

ایک خاتون (گیتان جلی کتابوں میں سے اٹھا کر)۔ ”یہ تراجم درست بھی ہیں یا نہیں؟“

ایک صاحب۔ ”گیتان جلی کے لفظ کی ترکیب از روے قواعد کیا ہے؟“
ایک دوسری خاتون۔ (گیتان جلی میں دکھلا کر)۔ ”کیا حضرت مصنف کی صورت بالکل ایسی ہی ہے؟ ماشاء اللہ کیا پاکیزہ“ ”ہندوالہانی“
خدو خال ہیں۔“

میں نے بہ مشکل تھام ٹیگور کے ان غائبانہ مداحوں سے رہائی پائی۔
چار پانچ روز میں سنا کہ شاہ سیکسنی کے حکم سے مجارستان (ہنگری) کی مشہور زمانہ مغنیہ نے گیتان جلی کے چیدہ مقامات حفظ کر شاہی سرود خانے میں سنا کر بے حساب داد حاصل کی۔

ایک مہینہ کے اندر اندر علاوہ ”باغبان“ اور ”ہلال“ کے تراجم کے ربندرا ناتھ کی سوانح عمری بھی شایع ہو گئی۔

یہ دو ممالک کی چشم دید حالت ہے اور اقلیم میں بھی ایسی ہی قدر و منزلت ہوئی۔ اہل فرانس کو نہایت وثوق سے یقین تھا کہ ”نوبل انعام“

اناطول فرانس Anatole France کو ملے گا۔ لیکن باوجود مایوس ہونے کے وہ قدر دانی میں کسی سے کم نہیں رہے۔ یورپ کی کوئی زبان ہی شاید ایسی ہو جس میں ٹیگور کا مجہوعہ نظم ترجمہ نہ ہو گیا ہو۔ رومانی۔ سربی۔ مجاری (ہنگیرین) زبانوں تک میں ترجمہ کا مجھے ذاتی علم ہے۔

(ب)

جب میں ہندوستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا میں بھی یہی حالت ہوئی ہوگی اور ٹیگور کے اعجاز قلم نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا۔ لیکن یہاں عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت کو ٹیگور کے نام تک سے نا آشنا اور خواص کو اُس کی خوبیوں کا منکر پایا۔ یہاں کے علمی طبقوں میں یہ حالت دیکھی کہ سخن فہموں کو داد تک دینے سے اغراض تھا۔ خود بنگال میں ندائے مخالفت بلند پائی۔ ع ”چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمان“ ہندوستان کی منطق یہ ہے کہ ٹیگور اور اقبال ہمارے ملک کے لحاظ سے بڑے شاعر نہیں ہیں لیکن اُن کا یورپ کے شعرا سے مقابلہ کرنا اور اُن کو مغنیان فرنگ کا ہمپایہ خیال کرنا یا استغفر اللہ اُن سے ارفع اور اعلیٰ قرار دینا نہ صرف سوے ادب بلکہ گناہ ہے۔ کہاں ہندوستان کی تیرہ خاک کہاں یورپ کی خلد گاہ۔ یہ خاک اور وہ عالم پاک۔ یہاں کے ساکنوں کو وہاں کے مکینوں سے نسبت ہی کیا ہے۔ اگر یورپ خود ٹیگور کی تعریف میں رطب اللسان ہے تو یہ کسر نفسی بھی کوئی مغربی ادا ہے اور اس میں بھی کوئی راز ہے ورنہ ہند کی خاک سے کوئی فرزانہ کب اُٹھ سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت۔ مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کستدر غلط

ایک صاحب نے جو انگلستان کی ایک معروف کلیہ کے فرزند ہیں اور انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتے ہیں فرمایا ”ٹیگور کے خیالات عیسویت کے خیالات ہیں جو اُس نے برہموسہاج کے ذریعہ سے ورثہ میں پائے ہیں

اہل یورپ نے مصلحتاً رہندراناتھ کو مشہور کیا ہے۔ ٹیگور کی شہرت سے درحقیقت تبلیغ دین مسیحی مقصود ہے۔ اس اعتراض کا بہترین جواب گیتان جلی کے معض سرسری مطالعہ سے کافی اور شافی مل سکتا ہے۔ جس بنگال کا ٹیگور فرزند ہے وہ بنگال ہے جو ”چے تنیادیو“ اور ”چندر اسین“ کے مشہور ناموں سے منسوب ہے۔ جس شخص نے ٹیگور کے والد ماجد ”دوندراناتھ ٹیگور“ کی سوانح عمری کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ٹیگور کا مذہب اپنشدوں کی لافانی تعلیم کے سوا کسی اور عقیدہ پر مبنی نہیں۔

ایک اور نہایت ذی علم فوجوان نے جن کا مطالعہ نہایت ہی وسیع ہے اور جو اکثر مغربی اور مشرقی ادب سے واقف ہیں فرمایا کہ میں ٹیگور میں کوئی نئی بات نہیں دیکھتا۔ یہ تمام خیالات قدیم ہندو اور جدید ہندی شاعری میں موجود ہیں۔ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جس طرح کوئی شخص ”میر درد“ ”خواجہ حافظ“ اور ”حکیم سنائی“ کے کلاموں میں اس وجہ سے کہ تینوں تصوف کے رنگ میں تو بے ہوئے ہیں امتیاز نہ کر سکے۔ یہ بجا ہے کہ ٹیگور کی بہت سی تشبیہات ”کالیداس“ سے مشابہ ہیں لیکن یہ معض اس وجہ سے ہے کہ دونوں خاص ہندی استعارات سے کام لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ٹیگور کے بہت سے خیالات ”کبیر“ سے ملتے ہیں لیکن اس کا باعث صرف یہ ہے کہ دونوں کا کلام حمد و سپاس الہی میں ہے۔ انگلستان میں بھی چند اشخاص نے جن کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ٹیگور کے کمال کا انکار اسی پیرایہ میں کیا ہے۔ ایک صاحب ٹیگور کو ”شہلے“ Shelley کا خوشہ چیں بتلاتے ہیں اور ایک اور ”فرانسیس ٹامپسن“ Francis Thompson کا مقلد خیال کرتے ہیں۔

(ج)

میں نے خود ایک زمانہ ہوا ”گیتان جلی“ کا ترجمہ کرنے کا قصد کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ ترجمہ نظم معرا (غیر مقفل) میں کروں تاکہ جہاں تک ہوسکے کلام کی

خوبی قائم رہے۔ لیکن چونکہ ٹیگور کے کلام کو ترجمہ میں ادا کرنے میں اس کی عظمت کے لحاظ سے ایسی ذمہ داری مجھے پر عائد ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہو سکا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ دس پندرہ مقامات ترجمہ کر کے رہ گیا۔ یہاں بطور نمونہ کے ایک مقام کا ترجمہ درج کرتا ہوں۔

گیتان جلی مقام ۹

موت دستک دیگی جس دم تیرے دروازہ پہ آ
کیا تواضع اپنے مہماں کی بجالائے گا تو؟
مرحباً! سلطان من حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بھر کرم فرمائے

جہاں مجھے ملک کی ناقدر دانی کا افسوس رہتا تھا وہیں اپنی بے کھالی کا بھی رنج تھا لیکن وہ بربط جس پر ٹیگور کے ترانہ توحید کی شور انگیز لے بلند ہو میری آغوش میں نہ سہاتا تھا۔ میری ارضی طبیعت اُس کی سہادی علویت کی تاب نہ لاسکی۔ لیکن الحمد للہ جس کام کو میں نہ کر سکا اُس کو ایک قابل ادیب نے پورا کیا۔

(د)

نسل شام کے اجداد نے عرب کے اُس دشت ناپیدا کنار کے آغوش میں تربیت پائی تھی جو ایک شیشہ ساعت کی طرح تھا اور جس میں وقت مدام ریگ افشانی میں مشغول رہتا تھا۔ اِس صحراے سہوم میں ویرانی کے سوا کوئی آباد نہ تھا جب سہوم رک جاتی تھی تو ہر جانب ایک پر رعب فضا پیما خاموشی مسلط ہو جاتی تھی۔ کسی درندہ کی ہولناک چیخ تک سکوت کو نہ توڑتی تھی۔ یہاں

قدرت معص آفتاب۔ ماہتاب۔ ستاروں اور ریت کا مجموعہ تھی۔ سورج کی تاب و تابش میں بھی ایک جلوۂ قہر تھا۔ ریت کی طیش جان اور آرام کی دشمن تھی چاند ستارے خوبصورت ضرور تھے مگر بے فائدہ اس لئے گو نسل شام نے کواکب پرستی کی بنیاد ڈالی لیکن اُن کے دل نے اپنے عقیدے پر خود گواہی نہ دی حضرت ابراہیم نے جو تقریر شمس و قہر کے طلوع و غروب اور ستاروں کو دیکھ کر کی وہ تمام نسل شام کی فریاد تھی جو دلوں سے زبان تک آگئی تھی گویا توحید یعنی یکتائی کا خیال قدرت نے اُن کے دلوں میں خود ودیعت کر رکھا تھا۔ آفتاب کا ثانی کوئی نہ تھا ماہتاب اپنی مثال نہ رکھتا تھا ازل اور ابد کے تصورات بھی تھیلگے دل میں موجود تھے کہیں سے کہیں نکل جانے پر بھی میناے لاجورد اور سراب دشت رفاقت نہ چھوڑتے تھے نہ صورت بدلتے تھے اس لئے جب اُن کو ایک ایسی ہستی سے آگاہ کیا گیا جو علائق دنیا اور قیود عالم سے آزاد ہے سب سے بالا موجودات سے ارفع۔ ازلی۔ ابدی۔ اور یکتا ہے اور جو مہر و ماہ۔ ریگ و دشت۔ عرش و فرش سے لا تعلق ہے جس کا علم قیاس و گمان بلکہ وہم سے برتر ہے تو اُنہوں نے بدل تسلیم کر لیا یہی مطلوب تھا جس کی اُن کو تلاش تھی۔

آریا نسل کے اسلاف نے جو ایران اور وسط ایشیا سے ہندوستان کی جانب آئے اُن عظیم الشان بیابانوں کو جن کو قدرت نے شیر و اژدر کی نشیمن گاہ بنایا تھا اپنی فرو د گاہ مقرر کیا۔ دامن ہمالیہ اور ہندرابین کے قدرتی سرسبز ساکھان معبد اور مندر قرار دئے گئے۔ جدھر نظر اُٹھتی تھی آب رواں اور سمیزہ زار پیش نگاہ تھا۔ ہر پیکر محسوس میں خدائی کار فرما نظر آتی تھی اور ہر میدان و جبل دریا اور رود آب سے افالعلق کی صدا بلند ہوتی تھی گونا گوں اٹھار شیریں من و سلویٰ کا کام دیتے تھے اور برفاب سے لہریز چشمے پیاس بجھاتے تھے۔ قدرت خود قاضی الحاجات تھی۔ طیور کی زمزمہ سنجی بزم

سماع اور شاہدان گل کی حسن آرائی معفل وجد تھی۔ کثرت میں ذات باری
پنہا بلکہ آشکارا نظر آتی تھی —

جب عربوں کا فارس پر اور مسلمانوں کا ہند پر تسلط ہوا تو ان دونوں
مذہبی خیالات کا بھی ایک دوسرے پر تصرف ہوا۔ اس سے ایران میں تصوف
نے فروغ پایا لیکن فطرتاً تصوف آریا نسل کے عجمی مسلمانوں کی طبائع سے
زیادہ رابطہ تھا۔ عربی الخیال مسلمانوں نے عموماً اپنی قدیم اسلامی روایات کو
قائم رکھا۔ شاعری ایک وسیع حد تک مذہب کی تابع ہے اس لئے ایک جانب تو
صوفی شعرا ع ”خود کوزہ خود کوزہ گر خود گل کوزہ“ خود رند و سہوکش
کی تفسیر بیان کرنے لگے دوسری جانب اسلامی شعرا ان الفاظ کو ورد کرتے رہے
اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

وزہرچہ خواندہ ایم و شنیدیم و گفته ایم

اُردو شاعری میں بھی جو فارسی کا تتبع ہے یہی دوئی کی کیفیت
موجود ہے ایک فریق فارسی ”ہمہ اوست“ اور ایک عربی ”ہمہ اوست“ کا
قائل ہے اس کے مقابل میں ہندو شاعری کی بنیاد ابتدا ہی سے ”وحدت الوجود“
پر مبنی ہے۔ ٹیگور کی شاعری ہندی شاعری ہے —

(۴)

فیضی کا سر دیوان یہ شعر ہے —

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا

نورک فوق النظر حسنک فوق اللہ

خواجہ میر درد اپنا کلام یوں شروع کرتے ہیں —

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا

حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے

کیا قاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا

لیکن ٹیگور فرماتے ہیں میں ایک جام سفال ہوں جس کو وہ رند حقیقی

رنگا رنگ سے سے معمور کرتا ہے توڑ دیتا ہے اور پھر اعجاز کوزہ گری سے وجود

میں لا کر الوان شراب سے لبریز کر دیتا ہے۔ نہ میرا کوتاہ پہچانہ بھرتا ہے نہ

وہ میکش سیر ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ازلے اور ابدی لب بوسی ہے —

خوشی تیری اسی میں ہے بنا اک جام گل مجھ کو

بھرے خالی کرے ہر دم زلال زندگانی سے

یا کہتے ہیں دنیا ایک صنم کدہ ہے میرا صورت گر خود میرا عاشق ہے

اس کا ذی حیات مس میرے تمام اعضا پر محیط ہے

یا کہتے ہیں میں وہ منتظر عورت ہوں جو اپنے شیام سندر کے انتظار میں سوئی

سیج پر طوفانی راتوں میں اُس کی آمد کی گھڑیاں گنتی رہتی ہے

وہ کسی جنگل کے کنارے کسی تاریکی کے پر پیچ عشق سے آنے والا ہے

آہ وہ بھی کیا ستم ظریف ہے ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب میں تھک کر

سو جاتی ہوں اور

اپنے بربط کے نغموں سے میری نیند کو بھر دیتا ہے اور میں اُس کا

دیدار چوک چوک جاتی ہوں جس کی سانس میری نیند کو

چھو چھو جاتی ہے

جب صبح کو عورتوں کے ساتھ پانی بھر نے جاتی ہوں تو کٹوئیں پر جہاں

”بابلا“ اور نیم کے درخت ہیں وہ آتا ہے اور ہتیلیاں جوڑ کر مجھ سے پانی

مانگتا ہے۔ اُس کی طلب میں کیا شیرینی ہے یہ حلاوت عمر بھر میرے دل سے

نہ جائے گی —

جب میں کاسے گدائی لے کر نکلتی ہوں تو وہ بادشاہوں کا بادشاہ

بن کر زریں رتھ میں سوار ایک عجب آن بان سے سامنے سے آکر میرا راستہ روک لیتا ہے اور مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا نیچے اتر آتا ہے میں خیال کرتی ہوں کہ میری حیات کا لمحہ خوش کامی آگیا اور امید کرتی ہوں کہ اب دولت چاروں طرف بکھر جائے گی لیکن ناگہاں وہ خود اپنا ہاتھ میرے سامنے بھیک کے لئے پھیلا دیتا ہے۔

یا کہتے ہیں عالم ایک محفل سہا ہے۔ فرس زمیں سے عرش بریں تک عالم امکان ترانہ معرفت سے لہریز ہے۔۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند

وز جدائیہا شکایت می کند

اور وہ ”نے“ میں خود ہی ہوں۔

پہرا اس نے کو تو لے کر ہراک کہسار و وادی میں

اسی میں کی ہے دم تو نے ہمیشہ تازہ موسیقی

یا کہتے ہیں کہ نہیں میں تو مغنی ہوں جس کی ملازمت حضور الہی میں نغمہ سنجی ہے۔

جب تو دیتا حکم ہے مجھ کو کہ ہوں نغمہ سرا

نضر سے دل میرا سینہ میں سہا سکتا نہیں

جب سب مغنی اپنا راگ ختم کر چکتے ہیں تو بربط نواز عالم خود بربط اٹھا لیتا ہے۔ اُس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔

سرود تیرا کرے ہے روشن تہام عالم کو اے مغنی

ہے روح نغمہ رواں فلک پر مثال تار حیات داہم

روان ہے گو سنگ ہوں مزاحم ترے ترانہ کا پاک دریا

ہے کیسی دل میں مرے تہنا شریک تیرے سرود میں ہوں

صوت سرمدی کو سن کر طائر روح عرش آشیان ہونا چاہتا ہے۔

اے طاؤراں قدس را افزودہ عشقت بالہا
در حلقہ سوداے تو روحانیاں را حالہا

چنانچہ کہتے ہیں—

طاؤر بازو کشادہ سینہ دریا پہ جوں
میں بھی خوش خوش ہوں رواں پیش نظر ہے آشیاں
کر وسیع شہاں نغمہ عرش تک آیا ہوں میں
تیرا پابوس مقدس تو کہاں اور میں کہاں

وہ نغمہ جو اس محفل میں بجاتا ہے سرود حقیقت ہے۔ اس سلطان الادکار میں
کوئی صدا یا ندا نہیں

مرے نغمہ کی آرائش نہیں جز عین عریانی
لباس اور ظاہری زینت سے تن اُس کا مبرا ہے
نہیں شہنم صفت اک پیرہن تک وصل میں حائل
نہ زیور جو تری سرگوشیوں میں غل سے خارج ہو

گویا بقول نظیر اکبر آبادی—

دل اُن کے تار ستاروں کے تن اُن کے طبل طہانچے ہیں
منہ چنگ زباں دل سارنگی یا گھنگرو ہاتھ کھانچے ہیں
بن تاروں تار ملاتے ہیں تب فرت فرالا کرتے ہیں
بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں بن پاؤں کھڑے گت بھرتے ہیں
جس گت پر اُن کا پاؤں پڑا اُس گت کی چال فرالی ہے
جس محفل میں وہ نانچے ہیں وہ محفل سب سے خالی ہے
ہیں راگ اُنہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ اُنہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سر قال ہوئے بن قال پکھاوج نانچے ہیں

یا کہتے ہیں کہ عالم ایک باغ ہے جس میں میوی ہستی ایک آرژومند پھول

اس فدا سے پھول کو بھر قبول
 شاخ سے چن لینے میں مت دیر سر
 ورنہ مجھ کو خوت ہے اے گلزار
 خشک ہو یہ خاک میں مل جائے گا
 گو پریدہ رنگ ہے اور بو نحیف
 رحم کر اور توڑ لے قبل از غروب
 وقت ہے باقی عبادت کا ہنوز
 بتکدہ میں کردے دیول پر نثار

(و)

ٹیگور کا علم الاخلاق اپنشدوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اپنشدوں کی تعلیم روحانیت کی تائید اور مادیت کے بطلان میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ روحانیت کیا ہے اور مادیت کیا ہے؟

گیتان جلی کے مترجم نے اپنے دیباچہ میں نئی روشنی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو ترک روحانیت پر بجا ملامت کی ہے اور اُن کی مغربیت کو جو ایک انجذاب گدایانہ اور تقلید غلامانہ ہے قابل نفی جنوں اور دیوانگی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اُن کی تحریر واضح اور عیاں نہیں ہے اور اُن کے مافی الضمیر سے کافی اطلاع نہیں دیتی۔

اپنشدوں کے روحانی فلسفہ کے متعلق اکثر ہندو مفسرین اس مغالطہ میں پڑ گئے ہیں کہ وہ دنیا کو محض مایا تصور کرتے ہیں اور صرف ترک دنیا کو ”نروان“ حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ اس مغالطہ سے رہبانیت کا خیال ہندوؤں کے اعتقاد میں راسخ ہو گیا ہے اور حیات ملکی اور ملی بجائے

جہد للبقا میں صرف ہونے کے منتشر اور ضائع ہو رہی ہے۔ مسلمان بھی لفظ ”روحانیت“ کو غلط قناعت اور بے محل استغنا کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

ٹیگور کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں —

ٹیگور کا مذہب ”جبریہ“ نہیں بلکہ ”قدریہ“ ہے وہ اپنی کتاب الاخلاق

”سادھنا“ میں کہتے ہیں۔

ماسوا کا اک جز ہونے کی حیثیت سے انسان نوامیس الہیہ اور

قوانین قدرت کا ضرور مطیع ہے لیکن بالذات ”انا“ قطعاً

آزاد ہے۔

سریکرشن مہاراج نے جو یہ فرمایا ہے کہ میں افعال سے بالا ہوں اس کا

یہ مطلب نہیں کہ کامل بشر بے کار اور بے شغل زندگی بسر کرتا ہے

بلکہ یہ مطلب ہے کہ جہاد زندگی اور تنازع الحیات میں کامیابی اور ناکامی

کے خیال سے آزاد ہو کر بے لوث کوشش کرنی چاہئے۔ ٹیگور ”سادھنا“ میں

بیان کرتے ہیں۔

زندگی کی خوشی کام میں ہے۔ کام میں ایک عجب لذت ہے۔ یہ

لذت تکمیل حیات میں مہد اور معاون ہے۔ کوئی ذی حیات اس

قدر معنت اور مشقت نہیں کرتا جس قدر انسان۔ اور یہی انسان

کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔ زندگی تغیرات باطنہ

کو تغیرات خارجہ سے مہائل اور مناسب کرنے پر منحصر ہے۔

ہمارے ملک میں لوگ حصول طاقت اور حصول وسعت کے روحانی

اصولوں کو بھول گئے ہیں۔ لوگ ”برہما“ سے صرف مراقبہ سے

معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور عالم کے کون و فساد میں جہاں

اُس کی ذات ذرہ ذرہ میں مصروف جہد ہے اس کو دیکھنے سے

گریز کرتے ہیں اس ایک طرفہ کیفیت سے ہندوستان کے مزاج میں
ایک مجذوبیت پیدا ہو گئی ہے جس نے ہمیں دین اور دنیا دونوں
سے کھو دیا ہے —

اگر کوئی شخص ”گیتان جلی“ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ٹیگور
کی تعلیم اعتکاف نشینی اور چلہ کشی ہے تو اس سے زیادہ کوئی اور غلطی ممکن
نہیں۔ صومعہ نشینی گناہ ہے کیوں کہ معرفت الہی کام میں ہے آرام میں نہیں۔
جو زن و فرزند۔ فرائض زندگی اور علائق دنیا سے بھاگتا ہے وہ خود خدا سے
بھاگتا ہے۔ چنانچہ ”گیتان جلی“ میں کہتے ہیں —

یہ عبادت نغمہ و سرود یہ تسبیح خوانی چھوڑ۔ دروازہ بند کر کے
خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تو کس کی پرستش
کر رہا ہے ؟

آنکھیں کھل۔ دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں —

وہ تو وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے۔ جہاں
سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے۔ وہ تو اُن کے ساتھ دھوپ
اور بارش میں ہے۔ اُس کا ملبوس خاک سے اُٹا ہوا ہے۔ یہ خرقتہ
سالوس اُتار کے پھینک دے اور اُسی کی طرح خاک زمین پر اُتر آ۔
زاہدانہ یا فلسفیانہ گوشہ نشینی ایک ابدی قبر ہے آزاد وہ ہیں جو
بنی نوع کو ظالمانہ قیود سے آزاد کرتے ہیں جو حریت کے علم بردار ہیں جن
کا لقب فاتح ہے جن کو خدا نے اپنی تیغ و ہر دار عطا کی ہے —

میرا خیال تھا کہ میں تجھ سے وہ گلاب کا ہار مانگوں گی
جو تیری گردن میں ہے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر صبح کی
منتظر رہی کہ جب تو جانے لگے گا تو بستر پر جو چند اجزا اس
کے رہ جائیں گے لے لوں گی۔ ایک بھکاری لڑکی کی طرح میں نے

صبح کو تلاش کی کہ ایک یا دو ہی باقی ماندہ پریشان پنکھڑیاں
مل جائیں؟ لیکن مجھے کیا ملا؟ تیری محبت کی کونسی نشانی
میں نے پائی؟

نہ وہ پھول ہے نہ کوئی خشبودار مسالہ نہ کوئی عطر کا طرت۔
وہ تیری زبردست تلوار ہے شعلہ کی طرح چمکدار اور گرج کی
طرح وزنی وہ تیری خوفناک تلوار ہے۔

جن کے لئے زندگی ایک روز مشقت ہے اُن کے لئے موت ایک پر راحت
شب آرام ہے۔ موت شبستان وصل کا دروازہ ہے۔

پھول گوندہ اٹھے گئے ہیں ہار دواہا کے اٹھے طیار ہے۔ شادی کے بدھ
دلہن اپنا گھر چھوڑ دیگی اور اپنے مالک سے تنہا رات کے سناتے
میں ملے گی۔



فرانسیسی مجلس علمی کی تاریخ

مترجمہ

(جذاب مولوی سید دواچ الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج)

فرانس کی مجلس علمی صرف اسی حیثیت سے دلچسپ نہیں ہے کہ اُس کا بانی ایک مشہور شخص تھا۔ یا یہ کہ مختلف مشاہیر نے اپنی دماغی کاوشوں سے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ اس کی دلچسپی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ صرف یہی مجلس اپنی نوعیت میں قدیم زمانہ سے اب تک بجنسہ چلی آ رہی ہے۔ پچھلے چند ہفتوں سے انگریزی اخبارات اور رسالوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ انگریزی ادیبوں کی بھی ایک مجلس قائم کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بحث اپنی ابتدا کے لحاظ سے فضل اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بے اثر ضرور ہے لیکن چونکہ بعض ہنگامہ آرا ادیب اسی مجلس کی ہیئت اور انتظام کو بطور نمونہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے شاید ان چیزوں پر نظر ڈالنا خالی اور فح نہ ہوگا۔

اب سے تھائی صدی پیشتر جب یہ مجلس قائم ہوئی تھی فرانس میں نوابی اور جاگیرداری کا دور دورہ تھا۔ پرانی نسل برسر حکومت تھی اور برائے ہی قانون نافذ تھے۔ اس کے قریب سو سال بعد انقلاب عظیم کی آمدھی کچھ ایسی آئی کہ اس نے ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک نہ صرف قدیم شاہی نسل اور اشرافیت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔ بلکہ

اُن تصورات اور طرز خیالات کا بھی خاتمہ کر دیا جو اس وقت تک رائج چلے آتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تباہی و بربادی کی اس خاک سے ایک نئے فرانس نے جنم لیا۔ لیکن پرانی افہمیں ہمیشہ کے لئے سوئی ہو چکی تھیں اور جو رہ گئی تھیں وہ زمانے کے اقتضاء سے اپنا روپ بدل چکی تھیں۔

اگرچہ (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا) تھوڑی دیر کے لئے فرانسیسی مجالس علمی کو بھی طوفان کے تھپیڑوں کے آگے سر جھکانا پڑا۔ لیکن اُسے کچھ زیادہ صدمہ نہ پہنچا اس کی اندرونی قوت ویسی ہی باقی رہی جیسی کہ قیام کے وقت تھی اور آج تک ہے۔ وہی تنظیم ہے۔ وہی قواعد و ضوابط۔ اراکین کی رہی تعداد جس میں آج تک کبھی اضافہ نہ ہوا۔ یعنی ”ابدی چالیس“۔

یوں تو شروع ہی سے اس انجمن پر متعدد حملے ہوئے اور اسکے دشمن کثیر تعداد میں اور پرجوش رہے ہیں۔ لیکن اتنے بے شمار خطرات کا مقابلہ اسے کبھی نہیں کرنا پڑا جتنا کہ آج کل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں موجودہ صدی * کا خاتمہ نزدیک آتا جاتا ہے ویسے ہی جمہوریت کی روح قوی تر ہوتی جاتی ہے اور ”تعمیر“ کی بجائے ”تخریب“ کا رنگ زیادہ گہرا جھانکتا نظر آتا ہے۔ یہ خصوصیت فرانس میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جہاں پرانی چیزوں کو سرے سے اُکھاڑ پھینکنے کا شوق ناقابل یقین شدت اختیار کئے ہوئے ہے۔ فرانسیسی مجالس علمی اس سیلاب سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ اسپر بھی ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ اثر ادیب جنہیں قدرتا اسکے حامیوں میں ہونا چاہئے تھا۔ مخالفین کے جتنے میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور تعصب اور جنبہ داری کا الزام لگا کر اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ دوسرے گروہ کو ان مخالفانہ حیلوں کا سبب پہلے گروہ کی معرومی نظر آتی ہے اور یہ کہ ان لوگوں کو

* یہ مضمون انگلستان کے مشہور رسالہ "Black Wood's Edinburgh Magazine" میں ستمبر ۱۸۹۱ء میں لکھا گیا تھا۔

مجلس کے اعزازات کے قابل خیال نہیں کیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ مجلس اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہے؟ یا بقرل میکالے نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح یہ بھی گرداب حوادث سے ابھر آئے گی اور جس طرح کہ گذشتہ صدی کے سیاسی تغیرات سے متاثر نہ ہوئی ہے آئندہ بھی کامیاب رہے گی اور پہلے کی طرح فرانسیسی ادب کی تاریخ میں صف اول میں اپنی جگہ قائم رکھے گی؟۔

انجام جو کچھ بھی ہو اس مجلس کی موجودہ حیثیت بغایت دلچسپ ہے اگر ایک طرف اس کی سند کو مشتبہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے دعووں کا مضحکہ اُرتا ہے تو دوسری طرف اس کے اعزازات کے حصول کی جتنی کوشش آج ہوتی ہے پہلے کبھی نہ ہرئی ہوئی اور اس کی خالی جگہ پر کرنے اور اس کی عمارت کے مشہور ”گنبد“ کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے جتنے حریف آج میدان میں اُترتے ہیں اتنے پہلے کبھی نہ ہوں گے۔

—————o—————

اگرچہ اس مجلس کا قیام فرمان شاہی کی ور سے سنہ ۱۶۳۵ ع میں ہوا لیکن دراصل اس کے قیام کی مدت اس سے پانچ چھ سال قبل کی ہے اور اس میں ”حسن اتفاق“ اور ارادہ دونوں کا یکساں دخل ہے اس مشہور و معروف مجلس کی ابتدا بہت معمولی تھی۔ سب سے پہلے ہمیں اس انجمن کی اصلی روح ”مالہرب“ (Malherbe) کے چہرے سے کھرے میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے جس کی کل کائنات چند بھرس کی کوسیاں تھیں! اس مختصر کھرے میں شہر ”پیرس“ کے علمی افراد جمع ہوا کرتے تھے اور عام دلچسپی کے موضوعوں پر بحثیں رہا کرتی تھیں۔ ناظم حلقہ کی رائیں (جو خرد بسی شاعر اور نقاد تھا) سنی جاتی تھیں اور اس مختصر جماعت کا کوئی شخص اگر کوئی تصنیف پیش کرتا تھا تو اس پر تنقیدیں ہوتی تھیں۔ خیالات ہی کو نہیں بلکہ زبان اور اسلوب بیان کو بھی سختی کے ساتھ جانچا جاتا تھا۔ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے

کہ شروع ہی سے فرانسیسی ادیبوں نے حسن صورت کو اپنا مطمح نظر بنایا اور آج تک ان کے ادب میں خیالات کی اتنی پروا نہیں کی جاتی جتنی کہ ان کے لفظی ملبوسات کی —

سنہ ۱۶۲۹ع میں جب ”مالہرب“ کا انتقال ہوا تو اس مختصر جماعت کے لئے جس کے افراد شہر کے دور دراز اور مختلف مقامات پر رہتے تھے آپس میں ملنا جلنا دشوار ہو گیا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ سب لوگ ہفتہ میں ایک مرتبہ ”ایم۔ کونرارت“ (M. Conrart) کے مکان پر جمع ہوا کریں اس لئے کہ اس کا محل وقوع کسی قدر مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور ”ادبی مباحث پر بحث کیا کریں اور سب سے زیادہ کوشش اس امر کی کریں کہ فرانسیسی زبان کی پاکی اور صحت میں ترقی ہو“ —

بتدا میں یہ مختصر جماعت صرف نو افراد پر مشتمل تھی ”کونرارت“ کے علاوہ ”ایم۔ شاپلین“ (Chapelain) بھی تھا جس کی سند ہر جگہ قابل قبول تھی جو تمام یورپ کے علمی افراد سے خط و کتابت رکھتا تھا اور اندرون و بیرون فرانس اس کی رائے کو ملہا نہ وقعت دی جاتی تھی۔ دوسرے اراکین یہ تھے۔ گودو (Godeu)۔ دی مالویل (De Maleville)۔ ہیبرت برادران جن میں کا چھوٹا بھائی ایبے دی کے ری سی (Abbe de Cerisy) کے نام سے مشہور ہے۔ ایم ژیری (Giry) ایم دی سیری زے وغیرہ۔ یہی وہ مرکز تھا جس سے فرانسیسی مجلس علمی کا آغاز ہوا۔ چند سالوں تک یہ لوگ اپنے جلسے کس میسر کی حالت میں کرتے رہے لیکن سنہ ۱۶۳۴ع میں ایم بواس رابرٹ کے ذریعہ سے لوئیس سیزدہم کے ذی اقتدار وزیر کارڈینل ری شی لیو (Richelieu) کو بھی ان جلسوں کی اطلاع ہوئی۔ بواس رابرٹ اس مجلس کے ایک رکن مے نارت کا دوست تھا۔ کارڈینل ری شی لیو کا مقرب خاص بھی تھا اور پیرس کے حالات سے اسے مطلع کرتا رہتا تھا —

وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ری شی لیو جیسے شخص کو اس گمنام جماعت کا حامی اور سرپرست بنا دیا؟ کیا یہ بھی ہر بات میں پیش پیش رہنے کی اُمنگ کا ایک کرشمہ تھا؟ یا ادبی شہرت کی خواہش اس کا سبب تھی؟ کیونکہ اتنا ہم جانتے ہیں کہ ری شی لیو کا جو وقت سیاسی داؤں گھات اور قتل کے حکمناموں پر دستخط کرنے سے بچتا تھا وہ شعر گوئی میں صرت ہوتا تھا! یا پھر کیا کارڈینل نے بھی دوسرے طباع لوگوں کی طرح اپنی الہامی قوت سے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ آج کی یہ حقیر جماعت مستقبل کی بڑی علمی انجمن ہوگی اور خود اس کا نام اس کے ساتھ منسلک ہو کر بقائے دوام کا مستحق ہو جائے گا!!

بہر حال جو کچھ بھی اصلی سبب ہو کارڈینل نے بواں رابرت کے ذریعہ اپنی سرپرستی کا پیغام پہنچا دیا۔ یہ دریافت کیا کہ کیا تم لوگ اپنی اس جماعت کو فرمان شاہی کے ذریعہ سے تسلیم کرانا چاہتے ہو اور بادشاہ سے اس فرمان کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا۔

اس پیغام کا سب سے پہلا اثر اراکین پر یہ ہوا کہ اُن میں انتہائی سراسیمگی پیدا ہو گئی۔ خوفناک کارڈینل اور ایک علمی انجمن کے معاملات میں دخل دے! تب تو آج سے آزادی اور باہمی خلوص کو خیر باد کہہ دینا چاہئے!! ان خیالات سے پریشان ہو کر انجمن نے اس اعانت کو قبول کرنے سے انکار ہی کر دیا ہوتا لیکن شاپلین نے جس کا حصہ انجمن کے معاملات میں اس وقت سے بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ تقریر کی۔ اُس نے اس نا عاقبت اندیشی کے انکار کی سختی سے مخالفت کی اور ایسے زبردست شخص کی دشمنی کے نقصانات بتائے۔ اُس نے کہا ”کارڈینل نے ایک تعویذ پیش کی ہے۔ اُس کی سرپرستی ہماری معاون ہو سکتی ہے۔ اُس کی مخالفت ہمیں بلا شبہ غارت کر دے گی..... ہم کو منظور ہی کرنا چاہئے“ دوسرے افراد نے اس رائے کے آگے سر تسلیم خم کیا

اور بالاتفاق رائے یہ طے پایا کہ انجمن کی طرف سے کارڈینل کو ایک خط لکھا جائے اور اس سے عنایت اور سرپرستی کی درخواست کی جائے۔ ایم سی ری نے یہ خط مارچ سنہ ۱۹۳۲ع میں لکھا۔ وہ اُس وقت انجمن کا ناظم تھا اور براس رابرٹ سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔

کارڈینل نے اس خط کا نہایت عطف و آمیز جواب بھیجا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ منشور شاہی بہت جلد حاصل کیا جائے گا اور اس نے انجمن کو نصیحت کی کہ اس مدت میں اراکین کی تعداد میں حسب صواب دید اضافہ کر لینا چاہئے۔ اپنے طور پر ایک دستور العمل مرتب کرنا چاہئے اور کسی نام کا انتخاب بھی کر رکھنا چاہئے۔ چنانچہ کئی نئے اراکین داخل کئے گئے اور تدریجی طور پر قی براس رابرٹ کا نام پہلے منتخب کیا گیا۔ نام کا انتخاب بھی ایک اہم کام تھا۔ بڑے بڑے زبردست نام پیش کئے گئے۔ لیکن انجمن نے حسن انتخاب سے کام لیکر سب کو رد کر دیا اور ”مجلس علمی فرانس“ سیدھا سا نام منظور کیا گیا اور اسی نام سے یہ مجلس ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ اراکین مستعدی کے ساتھ دستور العمل کی ترتیب میں مشغول ہوئے۔ اس کام کے لئے تین افراد کا انتخاب خاص طور پر کیا گیا۔ لیکن دوسرے افراد کو بھی عام دعوت تھی کہ اپنے خیالات اور تجاویز تحریری صورت میں پیش کریں۔ آخر میں ان سب کو ترتیب دیکر پچاس ضوابط کا ایک دستور العمل تیار کیا گیا۔ اکثر دفعات معمولی تھیں۔ لیکن بعض نہایت اہم بھی تھیں۔ مثلاً تمام اراکین مجلس کی کامل مساوات۔ اگر اس وقت کا لحاظ کیا جائے جب کہ طبقہ بندی کا بہت زور شور تھا تو یہ دفعہ ایک بڑی رعایت نظر آتی ہے۔ مجلس کی مقدس حدود کے اندر سب برابر تھے۔ گوشہ گھناسی میں پڑاؤ و مصنف۔ بڑے بڑے اسقفوں۔ ذی اقتدار وزرا۔ سربراہ آوردہ دیوک اور خود شاہزادوں کے برابر کا مرتبہ رکھتا تھا۔ مشہور و معروف کاندے (Conde) کی مہتری اور خود ہمارے زمانے میں دیوک آمین کی شرکت اس مساوات کا بین

ثبوت ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب لوئی چہار دہم کا مشہور وزیر کولبرٹ (Colbert) مجلس کا رکن ہوا تو اکثر رفقاء مجلس نے اُسے ”مان سی فی یار“ (Monsieur) ”حضور“ کہہ کے مخاطب کیا لیکن کولبرٹ نے جواب دیا کہ ”اس حلقے میں دوسروں کی طرح میں بھی صرف ”صاحب“ (Monsieur) ہوں!“

انتظام کی بہتری کے خیال سے یہ بھی طے پایا کہ مجلس خود اپنے حلقے میں سے تین عہدہ دار منتخب کرے۔ ایک ناظم۔ ایک چانسلر اور ایک معتمد۔ اول الذکر دو عہدہ داروں کا انتخاب بذریعہ قرعہ ہوتا تھا اور ان کی مدت عہدہ تین ماہ تھی۔ معتمد کا منصب اس کی حین حیات تک رہتا تھا اور اس کا انتخاب رایوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا یہی تینوں عہدے آج تک باقی ہیں لیکن اب ناظم اور چانسلر کا انتخاب بھی رایوں کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے۔

جب دستور العمل تیار ہو گیا تو منظوری کی غرض سے ری شی لیو کے پاس پیش کیا گیا۔ اس نے جملہ ضوابط کو سوائے ایک کے منظور کر لیا اور یہ استثنا اس کے لئے قابل تعریف ہے۔ جس ضابطہ کو اس نے رد کیا اُس کا منشا یہ تھا کہ ”موجودہ اور آئندہ تمام اراکین اپنے سرپرست کے معائنہ کی وقعت کریں اور اسے عزت کے ساتھ یاد کریں“ چونکہ کارٹینل کا اعتقاد تھا کہ استعسان اور شکرگزاری کے جذبات قافوں کے پابند نہیں ہو سکتے اس لئے اس نے اس ضابطہ ہی کو قلمزن کر دیا۔

ضوابط مجلس کی رو سے کارٹینل ری شی لیو کو بانی اور سرپرست کی حیثیت دی گئی اور اس ادارہ علمیہ کی سہر پر ایک طرف ری شی لیو کا چہرہ کندہ کیا گیا جس کے نیچے تاریخ قیام درج تھی دوسری جانب پھولوں کا ہار بنایا گیا اور چاروں طرف یہ عبارت کندہ کی گئی ”بقائے دوام“۔ یہی وجہ ہے

کہ اس مجلس کے اراکین کو مشترکہ طور پر ”ابدی“ کہا جاتا ہے۔ شاہ لوئی سیزدہم کے منشور کی رو سے جنوری سنہ ۱۶۳۵ ع میں یہ مجلس ”مجلس علمی فرانس“ کے نام سے قائم ہوئی۔ ری شی لیو اس کا بانی ہوا اور اراکین کی تعداد چالیس مقرر کی گئی اور اس میں آج تک اضافہ نہیں ہوا ہے۔

مجلس نے جن ضوابط کو منظور کیا تھا اور فرمان شاہی کی رو سے جن کی تصدیق کی گئی تھی ان کی مجموعی تعداد جیسا کہ کہا جا چکا ہے پچاس تھی اراکین کی مساوات کے علاوہ مجلس کو انتخاب اراکین کی بھی کامل آزادی عطا کی گئی تھی لیکن ایک اور دفعہ سے اس میں کسی قدر ترمیم کی گئی تھی اس کا منشا یہ تھا کہ ”تا وقتیکہ کوئی شخص سرپرست کی منظوری نہ حاصل کر لے اُس کا انتخاب رکنیت کے لئے نہیں کیا جاسکتا“ ری شی لیو نے جو اپنی مدۃالعمر انجمن کا سرپرست رہا اس دفعہ کا آزادانہ استعمال کیا اور انتخابات میں اس کا اثر بہت نمایاں رہا ہے۔ بعد ازاں جب بادشاہ وقت کو مجلس کا سرپرست بنایا گیا تو شاہی تردید انتخابات کو مسترد کر سکتی تھی لیکن اس کی ذہبت شاذ و فادر آنے پائی اگر ایک طرف مجلس اس بات کا خاص لحاظ رکھتی تھی کہ ایسے لوگوں کا انتخاب عمل میں نہ آئے جو غیر معمولی طور پر ”ناخوشگوار“ ہوں تو دوسری جانب بادشاہ بھی مجلس کی آزادی میں زائد از ضرورت دخل اندازی سے معترز رہتا تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ لوئی چہار دہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک رکن کو بالاتفاق رائے منتخب کر لیا گیا ہے تو اس نے اپنے اعتراضات واپس لے لئے۔ لوئی پانزدہم کی سرپرستی کے زمانہ کا ایک واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔

—————:O:—————

آج کل ”سرپرست“ کے عہدہ کا ذکر نہیں آتا تاہم ایک حد تک مجلس سردار قوم کے حکم کو تسلیم ضرور کرتی ہے خواہ وہ صدر جمہوریت ہو یا

شاہنشاہ۔ جب عوام کو کسی جدید انتخاب کی اطلاع دی جاتی ہے تو سب سے پہلے یہ ضابطہ کے الفاظ اب تک نظر آتے ہیں کہ ”اس انتخاب کے لئے سردار ملک کی اجازت حاصل کی جا چکی ہے“ یہ بھی دستور چلا آتا ہے کہ شرکت کے بعد جدید رکن کا تعارف مجلس کا ناظم اور معتمد صدر یا شاہ وقت سے کراتا ہے اور اسے اپنی تقریر کی (جو شرکت کے وقت کی جاتی ہے) ایک نقل گزرائی پڑتی ہے آج کل یہ رسم باتیں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں اس وجہ سے کہ اراکین مجلس کو کسی خاص صدر سے ذاتی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن فرانس میں جب ”شاہنشاہیت ثانوی“ کا دور تھا اس وقت اس کی حیثیت خاص طور پر نازک اور پریشان کن تھی۔ اس وقت ”ولی مین“ کو جو ناظم مجلس تھا سابق روایات کے بموجب ٹوی لیرز (قصر شاہنشاہی) جانا پڑتا تھا اور جدید اراکین کو بادشاہ کے سامنے پیش کرنا پڑتا تھا۔ لے کارڈیر۔ دی براگ ای۔ پرووست پارادول اور جونس فاورے اسی طرح پیش کئے گئے تھے۔

اگرچہ مجلس اپنے اراکین کا انتخاب کرتی ہے لیکن وہ اپنی طرف سے کبھی اعزازات پیش نہیں کرتی جو لوگ اس مشہور مجلس میں شریک ہونا چاہتے ہیں انہیں باضابطہ داخلہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ قاعدہ تقریباً ابتدا سے چلا آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بہت قدیم زمانے میں ایک دفعہ مجلس نے ایک شخص کے لئے اپنے یہاں کے اعزازات پیش کئے۔ لیکن اُس نے سیاسی وجوہات کے بنا پر اُن کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اُس انکار کو مجلس کے لئے باعث توہین سمجھا گیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سے اس کا موقع نہ آنے دیا جائے۔ ابتدا میں داخلہ کی اجازت حاصل کرنے کے لئے صرف معتمد کو ایک معمولی خط لکھنا کافی ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ داخلہ کا طریقہ پیچیدہ ہوتا گیا اور ہر امیدوار کا یہ فرض تھا (اور آج تک ہے) کہ وہ ”ملاقاتیں“ کرے۔ یہ ملاقاتیں باری باری سے ہر رکن مجلس کے ساتھ کرنا پڑتی تھیں اور اس کی موافق رائے کی استدعا کی جاتی

تھی۔ چالیس ملاقاتیں کرنا پڑتی تھیں۔ یا یہ کہو کہ اُقتالیس۔ اس لئے کہ تاوقتیکہ کم از کم ایک جگہ خالی نہ ہو۔ داخلہ ہو ہی کس طرح سکتا تھا۔

اکثر لوگوں کے لئے جو اپنی قابلیتوں کے اعتبار سے مشہور ”گنبد“ کے نیچے جگہ پانے کے مستحق تھے یہ ضوابط بسا اوقات شدید رکاوٹ بن جاتے تھے۔ بقول ایک فرانسیسی کے ”مجلس کے دروازے بہت پست ہیں اور اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ بغیر دیوار سے سر ٹکراے ہوئے اُن میں سے نکل سکے تو اُسے بہت جھکنا پڑتا ہے“۔

اب ہم اُس خاص مقصد سے بحث کرتے ہیں۔ جس کی تکمیل کے لئے یہ مجلس وجود میں آئی تھی۔ اس کے قیام کی خاص غایت کی منشور شاہی میں صاف طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ ”اُس کا کام یہ ہے کہ کہاں احتیاط و کوشش سے فرانسیسی زبان کو ترقی دی جائے۔ اُس کو کثافتوں اور آلائشوں سے پاک کیا جائے۔ الفاظ کا استعمال معین کیا جائے۔ مختصر یہ کہ زبان کو فصیح اور علوم و فنون کی بحث کے قابل بنایا جائے“۔

اس زمانہ میں یہ مقصد ہمیں کچھ زیادہ اعلیٰ و ارفع نظر نہیں آتا۔ لیکن اُس وقت جب زبان کافی طور پر معین نہ تھی۔ صورت برعکس تھی اور خود ”رلی شی لیو“ کے خیال میں یہ اعلیٰ ترین خدمت تھی جو یہ مجلس انجام دے سکتی تھی۔

مذکورہ بالا اغراض کی تکمیل و ترقی کے لئے یہ بھی طے کیا گیا کہ مجلس ایک لغت مرتب کرے۔ ایک قواعد زبان کی کتاب بھی لکھے اور فصاحت اور شاعری پر بھی رسالے شایع کرے۔ ہم یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ نظم۔ فصاحت یا قواعد پر کوئی کتاب کبھی نہ لکھی گئی اور ان چیزوں کو قواعد و ضوابط کی پابندیوں میں جکڑنا ممکن بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ یہ چیزیں اُسی وقت

کسی قابل کہی جاسکتی ہیں جب آزادانہ و بلا قیود و شرائط خدا داد ذہانت سے پیدا ہوں۔ لغت کا آغاز البتہ ہوا اور اسے اس مجلس کی اہم ترین اور مفید ترین کاوش کہا جاسکتا ہے۔

یہ سمجھ رکھنا چاہئے کہ مجلس کی کاوشوں سے ہماری مراد افراد مجلس کی مشترکہ مساعی سے ہے۔ ورنہ انفرادی طور پر اس کے اراکین نے جو کچھ خدمات کیں اُس کی تشریح نہ صرف بے محل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ اس لئے کہ اس کی پیدائش کے وقت سے بجز چند مستثنیات کے وہ جہلہ اہل قلم افراد اس کے اراکین رہ چکے ہیں جنہوں نے دنیاے علم میں کچھ بھی مرتبہ حاصل کیا ہے اور اُن کی تصنیفات کی تاریخ لکھنا گویا فرانسیسی ادب کی تاریخ لکھنا ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ع میں شاپلین * سے درخواست کی گئی کہ وہ لغت کا ایک خاکہ مرتب کرے۔ بعد ازاں اُس کی اور دوسرے اراکین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ لیکن کام کی رفتار بہت سست رہی۔ حتیٰ کہ بعض ظریفوں نے اس سستی سے عاجز آکر مجلس کو ”نکھوں کی مجلس“ کا نام دے ڈالا۔ لغت کے کام میں ”واگی لاس نے بھی اہم حصہ لیا۔ وہ اس کمیٹی کا صدر تھا جس کے ذمہ لغت کے خاکوں کی تیاری تھی اور مجلس کے ہر اجلاس میں یہ خاکے پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ ”واگی لاس نے سنہ ۱۹۳۹ع تک جو اس کی وفات کا سال ہے۔ کامل دس برس کمال جانفشانی سے کام کیا اور اُس کی زندگی ہی میں کسی قدر کام ہو چکا تھا۔ لیکن اُس کے انتقال کے بعد سے یہ براہر سست ہوتا رہا۔

* شاپلین کی تجویز جس پر لغت کی پہلی اشاعت میں عمل کیا گیا تھا موجودہ ترتیب سے مختلف ہے۔ بجائے تہجی کی ترتیب کے الفاظ کی ترتیب مادوں کے لحاظ سے کی گئی تھی۔ دوسری اشاعت میں یہ ترتیب خارج کردی گئی اور ترتیب تہجی قائم کی گئی۔

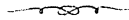
محض اس غرض سے کہ ”واگی لاس“ اپنا تھام وقت لغت کو دے سکے
 ”ری شی لیو“ نے اُس کا وظیفہ جو پہلے جاری تھا لیکن پھر بند ہو چکا تھا
 دوبارہ جاری کر دیا۔ جب وہ ”کارتی نیل“ کا شکریہ ادا کرنے گیا تو حسب
 ذیل اظیفہ آمیز گفتگو ہوئی ”کارتی نل“ متانت آمیز تبسم کے ساتھ اُس سے
 ملنے کے لئے بڑھا اور کہا ”ایم۔ واگی لاس مجھے اُمید ہے کہ آپ لغت میں لفظ
 Pension (پنشن) لکھنا نہ فراموش کریں گے“ واگی لاس نے جھک کر تعظیم
 ادا کی اور کہا ”قدس مآب! لفظ پنشن سے کہیں زیادہ مجھے لفظ Gratitude
 (شکر گزاری) لغت میں لکھنے کا خیال رہے گا“ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ
 ”کولہرت“ جو خود ایک رکن تھا۔ کمیٹی کے فقدان جوش کی وجہ سے مایوس ہوا
 اور چونکہ بعیثیت ایک عملی شخص ہونے کے وہ یہ چاہتا تھا کہ ہر کام جو کرنے
 کے لائق ہے فوراً ہو جانا چاہئے۔ اس لئے وہ دفعتاً مجلس کے دفتر میں پہنچ
 گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سب لوگ لفظ Ami کی تحقیق میں بہت مصروت ہیں۔ جب
 اُس نے اُن کی بعثتیں سنیں اور بطور خود اس کا بھی اندازہ لگا لیا کہ محض
 ایک لفظ کی تعریف میں کس قدر غور و فکر۔ عرصہ اور محنت کی ضرورت
 ہے۔ تب اُس کو اقرار کرنا پڑا کہ فی الحقیقت اُس کے قیاس کے مقابلہ میں کام
 کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور وہ بغیر زجر و توبیخ کئے ہوئے واپس ہوا۔

—:o:—

لغت کا کام کچھ اوپر تیس سال بعد یعنی سنہ ۱۹۷۲ ع میں ختم ہوا اور اس
 کے دو سال بعد ہی شاپلین نے جوابتدا ہی سے اس کے ترقی دینے والوں میں سے تھا
 اور جسے مرتے دم تک لغت کے ساتھ گہری دلچسپی رہی انتقال کیا۔
 بد قسمتی سے جب لغت مکمل ہو چکی تو یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے ابتدائی
 حصے جو اُس وقت مرتب کئے گئے تھے جب کہ فرانسیسی زبان نے کوئی معین
 صورت اختیار نہ کی تھی متروکات سے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ پوری لغت کی

فظر ثانی اور کہیں کہیں فٹے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اس کام میں بیس سال اور صرت ہو گئے اور یہ لغت اپنی مرتب و مکمل حیثیت میں سنہ ۱۶۹۳ ع سے قبل (یعنی اپنی ابتدا کے پچاس سال بعد) شایع نہ ہو سکی۔ اٹھارویں صدی میں اس کے جدید ادیشن وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ ایک اور ادیشن سنہ ۱۸۳۵ ع میں نکلا اور جدید ترین یعنی ساتواں ادیشن سنہ ۱۸۷۷ ع میں شایع ہوا۔ اشاعت کے بعد ہی سے یہ کتاب فرانسیسی زبان کا معیار تسلیم کی گئی اور آج تک مستند چلی آتی ہے۔ جو لفظ اس کے صفحات میں نہ پایا جائے اُس کے لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے باقاعدہ طور پر باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ گون کورت اس خیال کا مخالف ہے۔ اس کی رائے ہے کہ ”چونکہ فرانسیسی زبان اپنے سرمایہ کے اعتبار سے السنۂ جدیدہ میں سب سے زیادہ غریب ہے اس لئے کم از کم میں کسی ایسے لفظ کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا جس میں اداۓ مطلب کی صلاحیت پائی جائے۔ خواہ اُسے مجلس علمی کی گاری میں سوار ہونا * نہ نصیب ہوا ہو“ —

لغت کی بحث ختم کرنے سے پہلے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ مجلس نے ایک جدید اور جامع ترین لغت مرتب کرنے کا خیال کیا تھا۔ چنانچہ کام بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کی تکمیل میں کئی سال صرت ہو جائیں گے کچھ عرصہ ہوا کہ ”مجلس“ علمی اس کام سے دست بردار ہو گئی ہے۔



زبان کی نشوونما کے خیال سے ایک قاعدہ یہ بھی مقرر کیا گیا تھا کہ

* یہ فقرہ کسی قدر تسلیم طلب ہے۔ شاہ لوئی چہار دہم کے عہد حکومت میں یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ ہوا خوردی کو جاتا تھا تو اپنے ساتھ چند خاص خاص اور منظور نظر مقربین کو بٹھا لیتا تھا۔ پس یہ جملہ ”شاہی گاری میں سوار ہونا“ الطاف و مراہم خسروانہ کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ہر رکن باری باری سے ہفتہ میں ایک مرتبہ پوری مجلس کے سامنے تقریر کیا کرے۔ اس رسم کو تو بہت جلد ترک کر دیا گیا۔ لیکن ایک اور رسم قیام مجلس سے آج تک بدستور چلی آرہی ہے۔ یعنی جدید اراکین کے استقبال کے وقت تقریروں کا ہونا۔ ابتدا میں یہ جلسے مخصوص حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن بقول پراگت (جو کہ پریوں کی کہانیوں کا مشہور مصنف ہے) جو تقریر اُس نے اپنے داخلہ کے وقت کی تھی وہ اگرچہ اپنی فصاحت کے اعتبار سے سب کو پسند آئی لیکن خود اسکو یہ افسوس رہا کہ ایک محدود جماعت ہی نے اسے سنا۔ چنانچہ اُس نے تجویز کی کہ آئندہ سے اس قسم کے استقبالی جلسے عام ہوا کریں۔ اُس کی درخواست منظور کی گئی اور آج تک یہ کیفیت ہے کہ جب کبھی مجلس علمی کسی جدید رکن کا استقبال کرتی ہے تو عوام کی طرف سے بہت کچھ دلچسپی اور جوش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ خواتین خاص طور سے شرکت کے لئے بے چین رہتی ہیں اور تکت حاصل کرنے کے لئے ہفتوں پہلے سے گھروں میں سازشیں شروع ہو جاتی ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ موقع بھی کچھ کم تقریر اور مسرت انگیز نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ان تقریروں کو خطابت اور فصاحت کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے اور پرانے زمانہ کی طرح جب بوسوے کی تابش الفاظ اور رے سی نی کی فصاحت لوگوں کو مسحور کر دیا کرتی تھی آج بھی ری نین کی شوکت الفاظ اور پے لی ران کی ظرافت سامعین سے خراج تحسین وصول کیا کرتی ہے۔ جدید رکن کی تقریر ہمیشہ اپنے مرحوم پیشرو کی تعریف میں ہوتی ہے اور اس مشہور مجلس کا فصیح ترین رکن مجلس کی طرف سے اس کا جواب دیتا ہے۔

—:0:—

قیام مجلس کے کچھ عرصہ بعد ری شی لیو کی سرپرستی کے زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جو (Cid) سڈ کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۱۶۳۶ ع

میں یہ ناٹک جو کارنیلی کا شاہ کار ہے پہلی مرتبہ کھیلا گیا۔ اسے ہاتوں ہاتھ لیا گیا اور نوجوان مصنف کو پوری شہرت حاصل ہو گئی۔ لیکن ری شی لیو کو یہ کھیل کچھ زیادہ پسند نہ تھا۔ اور اس نے شدت سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ غالباً اس ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ فرانس میں خانہ جنگیوں کا بہت کچھ زور شور تھا اور کارتی نیل ری شی لیو نے اس کی روک تھام میں اپنی پوری قوت صرف کی تھی۔ لیکن اس املیہ کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک خانہ جنگی کا واقعہ بطور پلاٹ کے موجود ہے *۔

یم اسکدری نے جو خود بھی ایک بلند پایہ مصنف تھا اس درامے پر سختی سے تنقید کی۔ اس کی کچھ وجہ تو اُس کا اپنا علمی رشک تھا اور کچھ کارتی نیل کی خوشنودی کو بھی اس میں دخل تھا۔ ری شی لیو نے مجلس علمی سے خواہش کی وہ اس کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔ انفرادی طور پر اکثر اراکین مجلس سدا کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً جب ایبے دی کے ری سی سے کسی نے اس کتاب کے متعلق رائے دریافت کی تو اُس نے جواب دیا ”کاش میں اس کا مصنف ہوتا“ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ری شی لیو جس چیز کا آرزو مند ہے وہ آزادانہ تنقید نہیں۔ بلکہ عیب جوئی ہے اور چونکہ وہ مجلس کے اتنے بڑے محسن کو ناراض کرنا نہ چاہتے تھے۔ لہذا بہت عرصہ تک یہ عذر کرتے رہے کہ ”ضوابط مجلس اس وقت تک کسی کتاب پر تنقید کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ خود مصنف تنقید و تبصرہ کی خواہش نہ کرے“۔

لیکن بھلا ری شی لیو کب کسی عذر کو سنا تھا۔ وہ برابر مصر رہا۔ اس نے

* بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ری شی لیو Cid کی مقبولیت کو حسد کی نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ جیسا کہ ہم اس سے قبل بتا چکے ہیں۔ اسے بھی علمیت کا دعویٰ تھا اور اُس نے بھی ایک سے زیادہ ناٹک گلام طور پر لکھے ہیں جو کہ قصر امی میں کھیلے گئے تھے۔ علاوہ اس کے اس نے چند ڈراموں کا خاکہ بھی مرتب کیا ہے۔

ہو اس رابرٹ کو کارنیللی نے پاس بھیجا اور اُس سے بجبر تنقید کی اجازت حاصل کی۔ کارنیللی نے جن الفاظ میں اجازت دی وہ یہ تھے ”اراکین مجلس کا جوجی چاہے کریں اور چونکہ بقول آپ کے تقدس مآب کو بھی اُن کی رائے معلوم کرنے کا اشتیاق ہے۔ لہذا مجھے کچھ کہنا سنا نہیں ہے“ اب تو بمجبوری مجلس کو تنقید کرنی پڑی۔ لیکن چہہ مہینے سے پہلے اُن کی آخری رائے کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ شاپلین نے حسب دستور اس مرتبہ بھی نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کیا اور وہ یادداشت جو کارڈی نیل کے ملاحظہ کے لئے پیش کی گئی تھی اسی کی مرتب کی ہوئی تھی۔ ان یادداشتوں میں سڈ کے اکثر حصوں کو ہدف ملامت بنایا گیا اور جو کچھ باقی رہا تھا اس کی مٹی ادھوری تعریف کر کے خراب کی گئی*۔

اس فیصلہ کی کل وجہ غرض کارڈی نیل کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ کیونکہ اکثر اراکین مجلس اور خود شاپلین بھی اپنے نچ کے خطوط میں کارنیللی کی تصنیف کے مداح نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا یادداشت بعد کو ”سڈ پر مجلس علمی کے خیالات“ کے نام سے شائع ہوئی۔ مجلس علمی کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی جب تک وہ سڈ کے واقعہ پر روشنی نہ ڈالے۔ شروع ہی سے یہ واقعہ مجلس علمی کے مخالفوں کے ہاتھوں میں ایک کارآمد حربہ بنا ہوا ہے۔ مجلس علمی میں آزادی رائے کے فقدان کو وہ اسی واقع سے ثابت کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اُس مفادافہ بلکہ غلامانہ روش کو مطعون کرتے رہتے ہیں جو سرپرست مجلس (یعنی ریشی لیو) کے مقابلہ میں ظاہر کی گئی۔ خواہ وہ سرپرست وزیر سلطنت یا خود شاہنشاہ ہی کی حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس موقع پر شاپلین نے سب اراکین سے زیادہ ہوشیاری سے کام کیا۔

* مجلس علمی نے جس پہلو کو سامنے رکھ کر سڈ پر اعتراضات کیے وہ یہ تھا کہ ”یہ تصنیف اصول فن کے منافی ہے“۔

اور بہت خوبی کے ساتھ ہوا کے رخ اپنا جہاز چلایا۔ ری شی لیو کے نام جو خطوط اس نے لکھے ہیں وہ اتنا درجہ کے خوشامدانہ ہیں اور انہیں پڑھکر تعجب ہوتا ہے کہ حقیقی قابلیت اس طرح سے اقتدار کے سامنے سرنیاڑ جھکے! یہ سب کچھ سہی۔ لیکن ہمیں اس معاملہ میں سختی کے ساتھ گرفت بھی نہ کرنا چاہئے۔ یہ لوگ لاکھ کچھ ہوں پھر بھی انسان ہی تھے اور تقاضے بشریت سے مجبور۔ فیزیاد رکھو کہ یہ وقت وہ تھا جب کہ ادیب اور ادبیات کسی کی کچھ زیادہ پروا نہ کی جاتے تھے اور اُن کے سرپرست کا اقتدار ہمہ گیر تھا!

————— ۱۰ —————

بہر حال مجلس علمی نے بہت جلد سلطنت میں اپنا اثر پیدا کر لیا اور اس کی برکت سے طبقہ اعلیٰ کے افراد میں بھی علم کی چات پیدا ہو گئی جو بلند مرتبہ اس نے اُس زمانہ میں حاصل کیا تھا وہ کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اور اُن ممالک کی فہرست میں جہاں خداداد ذہانت اور فطری طباعی کو ان کے مناسب حال رتبہ دیا جاتا ہے فرانس کا نام سب سے اوپر لکھا ہوا نظر آئے گا۔

سنہ ۱۹۴۲ ع میں جب ری شی لیو کا انتقال ہوا تو چانسلر سی کی پرکو جو پہلے سے مجلس کا رکن بھی تھا سرپرست بننے کی دعوت دی گئی۔ اُس نے اسے قبول کیا۔ لیکن ساتھ ہی حق رکبیت سے دست بردار ہو گیا تاکہ آپس میں کوئی فرق مساوات محسوس نہ ہو سکے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مجلس علمی کو ایک ٹھکانے کا مکان نصیب ہوا۔ ابتداء قیام سے اس کے جیسے کسی نہ کسی رکن کے مکان پر ہوا کرتے تھے اور اس انتظام میں ہمیشہ رد و بدل کی ضرورت رہا کرتی تھی۔ سی کی پر نے خود اپنا محل پیش کیا اور اُس وقت سے تیس سال تک وہیں جیسے ہوتے رہے۔ مجلس علمی اپنے جدید سرپرست سے اتنی خائف نہ تھی جتنی کہ کارتی نل سے۔

اگرچہ مجلس چانسر کی بہت کچھ تعظیم کرتی تھی اور تمام متنازعہ فیہ مسائل پر اُس کی رائے کو قطعی تسلیم کرتی تھی۔ لیکن ”خود چانسلر نے کبھی مجلس کی آزادی میں دست اندازی نہ کی“ —

سنہ ۱۶۷۲ ع میں جب اُس کا انتقال ہوا تو مجلس علمی بہت کچھ شہرت حاصل کر چکی تھی بہت سے مشاہیر عصر اسکے اراکین کی صف میں مل چکے تھے۔ خود شاہ لوئی چہارم نے جسکے شباب و عظمت کا آفتاب اسوقت نصف النہار پر تھا سرپرست بننے کی خواہش کی۔ مجلس نے اس شہرت کو بہت خوشی اور فخر کے ساتھ منظور کیا اور سب اراکین ایک ساتھ مل کر بادشاہ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے قصر شاہی میں حاضر ہوئے —

— 101 —

لوئی اُن کے ساتھ کہاں اخلاق سے پیش آیا جب اُس کی نظار اپنے مشہور وزیر ”کول برت“ پر پڑی جو رکن مجلس علمی کی حیثیت سے اپنی جگہ پر موجود تھا تو اُس نے اُسے حکم دیا کہ جن ممبروں سے میں واقف نہیں ہوں انہیں باری باری سے میرے حضور میں پیش کرو۔ پھر اُسے علیحدہ بلا کر کہا ”مجھے بتلاؤ کہ میں ان اصحاب کے ساتھ کس تلافی سے پیش آؤں“ حقیقت یہ ہے کہ کولبرٹ نے اپنا تمام رسوخ ادب و فن کی ترقی میں صرف کیا اور ہمیشہ علم کا زبردست حامی و سرپرست رہا —

خود بادشاہ بھی مجلس کے ساتھ مراحم خسروانہ سے پیش آتا رہا۔ اُس نے انجمن کے لئے ایک شاہی محل وقف کر دیا اور اس کے فرمان کے بموجب اُس وقت سے مجلس علمی کے جلسے قصر ”لوور“ کے دارالشوریٰ میں ہونے لگے۔ شاہ لوئی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا تھا۔ مثلاً پہلے صرف ناظم مجلس کو آرام کرسی ملتی تھی اور دوسرے اراکین کے لئے چھوٹی چھوٹی کرسیاں تھیں جو بقول مورخ مجلس علمی ”بہت تکلیف دہ تھیں“ کارڈی نیل دی

استریس نے شہنشاہ کے حضور میں عرضداشت پیش کی کہ ”بوجہ ضعف و کمزوری مجھے بھی آرام کرسی مرحمت فرمائی جائے ورنہ حاضری سے قاصر رہوں گا“ بادشاہ نے نہ صرف اس درخواست کو منظور کیا بلکہ اپنے محل سے چالیس آرام کرسیاں بھجوا دیں تا کہ آپس میں رقابت نہ پیدا ہونے پائے ”چالیس آرام کرسیوں“ کا معاوضہ اسی وقت سے رائج ہے اور اکثر مجلس علمی اُسی نام سے مخاطب کی جاتی ہے۔

—————: 0 :—————

اگر کارتی نیل ری شی لیو نے مجلس علمی کو ساطنت میں بااثر بنا دیا تھا تو شاہ لوئی نے جس کا قول تھا کہ ”میں خود ریاست ہوں“ اُسے بڑھا کر اپنے ذاتی مرتبہ کی بلندی تک پہنچا دیا۔ اُس کا حکم تھا کہ ہر دربار اور دوسری رسومات ساطنت کے موقع پر چھ اراکین مجلس علمی کی نمائندگی کیا کریں۔ مختصر یہ کہ مجلس علمی کے لئے جسے وہ ”میری مجلس!“ کہا کرتا تھا وہ کوئی رعایت اٹھا نہ رکھتا تھا۔

کہتے ہیں کہ شاہ لوئی کو فصاحت اور شاعری کا خاص شوق تھا۔ لیکن بقول مورخ ”جب یہ چیزیں اُس کے لئے استعمال کی جاتی تھیں تو یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ جاتا تھا“ چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ اِس زمانہ میں جس کا حال ہم اب لکھ رہے ہیں انجمن کے مقاصد و اغراض وہ نہ رہے تھے جو قیام کے وقت تھے۔ فصعائے مجلس فتوحات شاہی کے اعلان سے کبھی نہ تھکتے تھے اور شعرائے مجلس کو سوائے اوصاف شاہی کی قصیدہ خوانی کے اور کوئی کام نہ تھا۔ حق یہ ہے کہ یہ شوق آستان بوسی جو پرستش کی حد تک پہنچ گیا تھا آج کل نہ صرف ناقابل یقین بلکہ مضحکہ خیز نظر آتا ہے اور اس شاندار ادارہ علمی کے دامن پر ایک بدنہا دھبہ معلوم ہوتا ہے ہم صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت احساسات کی عام رویہ تھی اور یہ مجلس بھی اپنا دامن

اس سے نہ بچا سکی۔ دئی سے لیکر اعلیٰ تک ہر طبقہ دیوتا کی طرح شاہ لوئی چہاردہم کی پرستش کرتا تھا اور جب رے سینی جیسے بلند رتبہ شاعر کی نسبت ہم یہ پڑھتے ہیں کہ وہ معض اس صدمہ کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکا کہ ”بادشاہ نے اس پر نظر عتاب دالی تھی“ تو ہمیں اس جوش عقیدت کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔

—————:O:—————

فتاب شاہنشاہیت کی ضیاباریوں نے (شاہ لوئی Sim-King بادشاہ سورج کہلاتا تھا) مجلس علمی کے حق میں مسیحا ئی کی اور اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ فرانسیسی ادبیات کی تاریخ میں عہد زرین کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ کیا مجلس علمی اپنے منشاء تخلیق یعنی فرانسیسی زبان کی ترقی کو پورا کر چکی تھی؟ بیشک۔ کیونکہ اس کے پینتیس سالہ قیام میں زبان نے زبردست ترقی کی تھی بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ارتقاء اور حسن کی معراج پر پہنچ گئی تھی۔ بوسوے کے پر شکوہ خطبات اور رے سینی کے املیہ قصوں کی فصاحت یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں آج تک کوئی نیچا نہ دکھا سکا اور جن کی نظیر شاذ و نادر ملتی ہے۔

—————:O:—————

اس اثنا میں فرانس میں ایک ایسا روح پرور جھونکا آیا جس نے فرانسیسی ادبیات کے حق میں اعجاز مسیحا ئی کا کام کیا۔ ملک میں ہر طرف سے خدا داد ذہانتیں ابھرنے لگیں اور انہوں نے دنیا کے سامنے ایسی تصنیفات پیش کیں جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔ خود مجلس علمی کی چار دیواری کے اندر رے سینی۔ بوائے لو۔ لابروای۔یر۔ فی۔ فی۔ لون اور ان سب کے سرتاج یعنی بوسوے جیسے باکمال پیدا ہوئے۔ فی الحقیقت یہ صدی ایک یادگار صدی ہے اگر ایک طرف شاہ لوئی کی فتوحات تھیں تو دوسری طرف آسمان علم کے درخشاں ستاروں

نے اس میں چار چاند لگا دئے تھے۔

—:O:—

اراکین علمی کو معاوضہ سب سے پہلے کولبرٹ کے زمانے سے ملنا شروع ہوا جب کارڈی نیل نے اس مجلس کا افتتاح کیا تو اس وقت کسی قسم کا معاوضہ مقرر نہ تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ری شی لیو میں مخیرانہ جذبات کی کمی تھی کیونکہ وہ خود اکثر علمی افراد کو وظائف دیا کرتا تھا بلکہ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ یہ مجلس ایک آزاد جماعت رہے اور بوالہوس لوگ ہوس زر سے اس میں شرکت کی کوشش نہ کریں لیکن کولبرٹ انتہا درجہ کا با عمل شخص تھا جب اس نے اراکین کی حاضری کو ابتر دیکھا۔ کیونکہ بقول مورخ ”کچھ لوگ اس وقت داخل ہوتے تھے جب دوسرے رخصت ہوتے تھے“ تو اُس نے ایک رجسٹر حاضری تیار کرایا اور ہر مہر سے درخواست کی گئی کہ وہ داخل ہوتے ہی اپنا نام اس پر لکھ دیا کرے۔ اس کے حکم کے بموجب مجلس کے ہر اجلاس کے موقع پر چالیس چاندی کی تکیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ جو لوگ غیر حاضر ہوتے تھے انہیں کچھ نہ ملتا تھا اور اُن کا حصہ مساوی طور پر حاضرین میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر صرف ایک ضعیف العمر رکن حاضر تھا اور کھال مسرت کے ساتھ چالیسوں تکیاں سپیت کر لے گیا۔

کولبرٹ کے اس خیال کی اکثر اراکین بے بھی مخالفت کی کیونکہ وہ درتے رہتے تھے کہ کہیں مجلس کی آزادی میں کوئی خلل نہ واقع ہو لیکن چونکہ خود یہ رقم بہت حقیر تھی یعنی زیادہ سے زیادہ چند سو فرانک سالانہ۔ اس لئے آخر سب نے اس اختراع کو قبول کر لیا۔ اس بحث کو چھوڑنے سے پہلے ہم اتنا اور گہدینا چاہتے ہیں کہ آج کل اراکین کو سالانہ پچاس پونڈ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ماہ کے آخر میں کچھ معمولی سی رقم ان لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے جن کی حاضری سب سے زیادہ باقاعدہ رہی ہو۔ اس سے صرف نگہیوں

کی قدیم رسم کا باقی رکھنا مقصود ہے —

—: 0:—

لوئی چہار دہم کی وفات کے بعد اس کے جانشین لوئی پانز دہم اور لوئی شانز دہم باری باری سے مجلس کے سرپرست رہے۔ یہ مجلس بحیثیت ایک جماعت کے اُن ادبی خیالات کی مخالف نہ تھی جو اٹھارہویں صدی میں دفعتاً اُبھ پڑے۔ مذہب فلاسفہ کے تمام خاص خاص افراد سوائے روسو کے اس کی چھت کے نیچے جگہ پا چکے ہیں۔ لوئی ہفدہم کا زمانہ بھی مجلس کے لئے سکون اور اطمینان کا زمانہ ثابت ہوا لیکن اس کے برے دن تیزی کے ساتھ نزدیک آتے جا رہے تھے اور جس انقلاب نے کہ شاہنشاہیت کو اُکھاڑ پھینکا اور مذاہب کو متا دیا اُس سے بھلا فرانس کی سب سے بڑی مجلس کس طرح بچ سکتی تھی۔ یوں تو یہ مجلس اپنی فیاضی اور رحم کے جذبات کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے لیکن اس موقع پر یہ خاص طور سے مستحق ستائش و تعظیم ہے۔ اگرچہ اس کے بعض اراکین کے سروں میں انقلاب کی ہوا کسی قدر سہائی ہوئی تھی لیکن ان میں کا ایک فرد بھی اُس خونریز جماعت کا شریک کار نہ ہوا جس نے شاہ لوئی کی موت کا فتوئہ کر دیا تھا اور فرانس کے مایہ ناز فرزندوں کو سولی پر چڑھا دیا تھا —

—: 0:—

سنہ ۱۷۹۳ء میں جسے بجا طور پر آشوب فرانس (Reign of Terror) کا نام دیا جاتا ہے اس مجلس کے معدودے چند اراکین پیرس میں باقی رہ گئے تھے بعضوں کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کی جگہیں خالی تھیں۔ کچھ موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے تھے اور کچھ جلا وطن ہو چکے تھے پھر بھی جو کچھ دو چار اراکین بچے تھے وہ حسب دستور ہفتہ میں ایک مرتبہ اکٹھا ہوا کرتے تھے مارلٹ نے جو اس وقت فاطمہ کے فرائض انجام دیتا تھا جب یہ دیکھا کہ اب طوفان آنے ہی والا ہے

تو اس نے کہاں حزم و دراندیشی سے انجمن کے تمام کاغذات فرامین وغیرہ ایک محفوظ مقام پر رکھ دئے اور اس طرح انہیں تباہی سے بچا لیا۔ کیونکہ ۸ اگست سنہ ۱۷۹۳ ع کو ایک فرمان صادر ہوا کہ یہ انجمن ایک بے فائدہ چیز ہے لہذا اسے توڑ دیا جائے۔ مجلس کے دروازے مقل کر دئے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ ”مجلس علمی فیز تمام علمی انجمنوں کا مال و اسباب سب جمہوریت کی ملک ہو گیا ہے۔“

—————:0:—————

لیکن خدا خدا کر کے یہ پر آشوب زمانہ ختم ہوا اور اس مجلس کی تفسیح بھی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ دو سال کے اندر ہی اندر یعنی سنہ ۱۷۹۵ ع میں مجلس ملیہ کے حکم کی بنا پر ایک مجلس قائم کی گئی اور اس کی بدولت اُن تمام مجلسوں کو جو دو سال پہلے فنا کر دی گئی تھیں نئے سرے سے زندگی ملی۔ اس نئی انجمن کو (L'Institut de France) ”ادارۂ علمیہ فرانسیہ“ کا نام دیا گیا۔ اسے تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان میں سے ایک کسی حد تک مرحوم مجلس علمی کی نہائندگی کرتا تھا۔

سنہ ۱۸۰۳ ع میں جب نپولین اول صدر اعظم ہوا تو اس نئی انجمن میں بہت کچھ اضافہ اور ترمیم ہوئی۔ اس وقت اس کے چار شعبہ کئے گئے اور قدیم مجلس علمی کو ایک علیحدہ شعبہ یعنی نمبر ۲ دیا گیا اور اس کا نام ”شعبہ زبان و ادبیات فرانسیہ“ رکھا گیا اور دراصل یہ شعبہ مجلس علمی ہی تھی جس کا نام بدل دیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں بہت سے پرانے قواعد و ضوابط دو بارہ رائج کئے گئے۔

—————:0:—————

نپولین مجلس علمی کے احیاء کا موید تھا لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی آرزو تھی کہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی وہ سیاہ سفید کا مالک رہے اور کبھی

کبھی تو وہ بہت سخت گیر مالک ثابت ہوتا تھا۔ پھر بھی ان اراکین مجلس کو ہزار آفریں ہے جنہوں نے اُس کی خواہشات کو اپنے ضمیر کے منافی پا کر اُن کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ دلیل نے اُس کے مظالم کی قصیدہ خوانی سے صات انکار کر دیا۔ سوارڈ پر جب دیوک آن گئیں کی پھانسی کے بعد زور ڈالا گیا کہ وہ ایک مضمون لکھے تاکہ عام احساس وفاداری میں جہاں رخنہ پڑ گیا ہے پھر استحکام پیدا ہو جائے تو اُس نے بھی صات انکار کر دیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ دلیرانہ مقابلہ شاتوبرایاں نے کیا۔ اُس کے انتخاب کے بعد ایک دن اُس کے استقبال کے لئے مقرر کیا گیا اور اس موقع کے لئے اُسے حسب دستور ایک خطبہ تیار کرنا پڑا۔ نپولین نے اس کی نقل بغرض ملاحظہ طلب کی۔ اس خطبہ کا اکثر حصہ آزادی کی تعریف میں تھا۔ اس کا ذکر نہایت پر جوش الفاظ میں کیا گیا تھا اور علم کی نہو کے لئے اُسے اتنا ہی ضروری بتایا گیا تھا جتنی کہ ہوا زندگی کے لئے ہے۔ اس خطبہ کا خاتمہ اس طرح ہوا تھا ”پس آزادی علم و فن کی فطری دولت ہے اور جب اسے جمہور کے درمیان سے بزور بھگا دیا جاتا ہے تو یہ جمہور ہی میں پناہ لیتی ہے“ نپولین اسے پڑھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس نے کہا ”اگر یہ خطبہ عوام کے سامنے پڑھا گیا ہوتا تو میں مجلس علمی کو نیست و نابود کر دالتا اور شاتوبرایاں کو تاریک ترین تہ خانہ میں پھنکوا دیتا“ اُس نے فوراً ناظم مجلس کو طلب کیا اور اُس سے کہا ”کیوں جناب! یہ آپ کی مجلس کو سیاسی مجلس بننا کب سے نصیب ہوا؟ یہ نظمیں لکھ اور زبان کی غلطیاں درست کرے لیکن اگر اُس نے اپنی حد سے آگے پاؤں بڑھائے تو بہت جلد تہ کیل دی جائے گی وغیرہ“ بالآخر مسودہ شاتوبرایاں کے پاس واپس بھیج دیا گیا۔ خود نپولین نے اپنے قلم سے اس کی تصحیح کی تھی اور قابل اعتراض مقامات کو بڑی بڑی ترچھی لکٹیروں سے کات دیا تھا۔ مجلس کی خواہش تھی کہ شاتوبرایاں دوسرا خطبہ تیار کرے لیکن اس نے رکھائی کے ساتھ انکار

کر دیا۔ اگرچہ اُس کا انتخاب فسخ نہیں کیا گیا تاہم اس کی توثیق بھی نہ ہو سکی اور جب تک کہ سلطنت کا خاتمہ نہ ہو ایسا اُس نے مجلس میں جگہ قبول نہ کی۔ عود شاہنشاہیت کے بعد مجلس کو سابقہ حقوق حاصل ہوئے۔ اُس کے پرانے ضوابط پھر رائج ہوئے اور اس کا قدیم نام ”مجلس علمی“ جو اس کے کارناموں سے مشہور ہو چکا تھا لیکن انقلاب کے بعد سے مٹا دیا گیا تھا اُسے دوبارہ ملا۔ شاہ لوئی ہیزدہم نے حسب روایات قدیم اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کے بعد اُس کا جانشین چارلس دہم سرپرست ہوا۔

—:O:—

وہ فرمان شاہی جس کی رو سے لوئی ہیزدہم نے اس مجلس کی تجدید کی تھی ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۱۶ء کو صادر ہوا لیکن اس تجدید کی یاد کے ساتھ ملی جلی چند افسوس ناک واقعات کی یاد بھی اسی وقت سے چلی آتی ہے۔ بنا بر حکم شاہی اراکین کی فہرست سے گیارہ نام خارج کر دئے گئے گویا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لئے مجلس سے باہر کر دئے گئے۔ اسی حکم کے بموجب چند نئے اراکین زبردستی شریک مجلس کئے گئے حتیٰ کہ کسی رسمی انتخاب کی بھی زحمت گوارا نہ کی گئی۔ ہمیں شاید اس صراحت کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ خارج شدہ اراکین وہ تھے جو یا تو انقلاب پسند جماعت میں شریک تھے یا پھر شاہ نپولین کے حامیوں میں سے تھے! اور ان کی جگہ جن اراکین نے لی وہ سب کے سب اکتھا درجہ کے ”شاہ پسند“ تھے اور ان میں سے اکثر کی شرکت کا سبب ان کی ادبی خصوصیات اتنی نہ تھیں جتنا کہ ان کے سیاسی رجحانات۔ یہ ایک ایسا غیر منصفانہ طرز عمل تھا کہ اس کی طرف سے چشم پوشی کرنا کسی صورت سے ممکن نہیں ہے اور یہ بات کہ مجلس نے اپنے ضوابط اور آزادیوں کو اس طرح پامال ہوتے ہوئے دیکھا اور کسی قسم کا احتجاج نہ کیا اس قدیم مجلس کے دامن پر ایک نہایت بد نما دھبہ بنگر آج تک قائم ہے۔

لیکن جب چارلس دہم کے زمانہ میں سنہ ۱۸۲۷ء میں فرانسیسی حکومت کی طرف سے مجلس نائبین کے سامنے ایک تحریک پیش کی گئی جس سے پیرس کی آزادی میں خلل واقع ہوتا تھا تو مجلس علمی کا رویہ مذکورہ بالا طریق عمل سے مختلف تھا۔ ابھی مجلس نائبین اس قانون کے مسودہ پر غور بھی کرنے نہ پائی تھی کہ مجلس نے متفقہ طور پر اس دست اندازی کے خلاف صدارت احتجاج بلند کی۔ جتنے اراکین پیرس میں موجود تھے اُن سب کا ایک جلسہ کیا گیا۔ ایم بدک ری تیلی نے ایک پر زور تقریر کی۔ اُس نے کہا ”کیا بادشاہ وقت اس کا معاذ ہے کہ جب اس کا جی چاہے فرانس میں آزادی خیالات کو سلب کرے“ اس تقریر کے خاتمہ پر بالاتفاق رائے یہ طے پایا کہ بادشاہ کے حضور میں ایک عرضداشت پیش کی جائے۔ اس کو مرتب کرنے کی غرض سے تین اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ ناظم مجلس نے عرضداشت پیش کرنے کی غرض سے باریابی کی اجازت طلب کی لیکن بادشاہ نے اُس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ جن تین اراکین نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا اُن کے ساتھ بہت کچھ سختی کی گئی اور اُنہیں عہدوں سے برطرف کر دیا گیا تاہم یہ تجویز منظور نہ ہو سکی اور مجلس نائبین کی مخالفت کی وجہ سے حکومت نے اُسے واپس لے لیا۔

—:O:—

اس واقعہ کے بعد ہی سے نہ صرف مجلس علمی کے تفکرات اور تقریروں میں بلکہ اُس کے اراکین کے انتخاب میں بھی ایک آزادی کی روح کام کرتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ اس موقع پر ہمیں اس تحریک کا ذکر کرنا پڑتا ہے جو کچھ سال پہلے سے چلی آرہی تھی اور جس نے علمی افراد کے درمیان ایک طرح کی جنگ پیدا کر دی تھی۔ ہماری مراد اُس نئے مذہب ادبیات سے ہے جو دفعتاً ”مود شاہنشاہی“ کے پہلے سال میں نمودار ہوا اور جسے قدیم مذہب

ادبیات سے ممتاز کرنے کی غرض سے ”رومانیت“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور پرانے قواعد و ضوابط کے پیروں کو قدیم یا کلاسیک مذہب ادبیات کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی ادبیات نے جو کچھ اثر فرانسیسی دماغ پر کیا وہی آگے چل کر اس تحریک کا سبب ہوا۔ ”شاورایاں“ اور ”مادام استیل“ کی تصانیف نے اس اثر کو اور تقویت دی اور دراصل یہی دونوں اس مذہب کے امام اول کہے جاسکتے ہیں۔ ”مادام استیل“ ہی نے سب سے پہلے لفظ رومانیت استعمال کیا۔ برق و رعد کا شور تو سنہ ۱۸۲۰ ع ہی سے سنائی دے رہا تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۲۳ ع میں یہ طوفان اپنی انتہائی شدت کے ساتھ اُٹھا۔ اس ادبی جنگ کا خاص سبب ”آگر“ معتد مجلس علمی کی ایک تقریر تھی۔ جس میں بھری مجلس میں اس نئی تحریک کو ہدات ملامت بنایا گیا تھا اور رومانفیوں (Romanticists) کو ”ادبی بدعتیوں“ کا لقب دیا گیا تھا۔ ”آگر“ کا حصہ اس ادبی پیکار میں بہت کچھ پر جوش رہا ہے۔

مجلس علمی نے بحیثیت جماعت ان مناقشات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ کیوں کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے بغیر مصنف کی خواہش کے کسی تصنیف پر تنقید و تبصرہ کرنا قواعد مجالس کے منافی تھا۔ علاوہ ازیں مجلس نے اس معاملہ میں غیر جانبدارانہ روش کو پسند کیا اور اس خوت سے کہ کہیں اُس کے وقار اور شان میں کوئی خلل نہ واقع ہو اس جھگڑے ”سے الگ تھلگ رہی اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ کچھ اسی مرتبہ نہیں بلکہ ہمیشہ یہ مجلس قدیم روایات کی دلدادہ رہی ہے اور ہر نئی تحریک کو خاص کر اُس کے آغاز کے وقت مشتبه نظروں سے دیکھتی رہی ہے۔ ہاں تو اگرچہ مجلس علمی نے اجتماعی طور پر اپنا دامن بچائے رکھا لیکن انفرادی طور پر اُس کے اراکین علی الاعلان میدان کارزار میں اُتر آئے اور اس نئی تحریک کے شدید ترین مخالف اکثر اراکین مجلس ہی تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ مجالس میں وسعت نظر پیدا ہونے لگی۔

”شاوبرایاں“ تو بہت پہلے سے رکن تھا۔ سنہ ۱۸۲۵ ع میں ”کاسی مر دی لادین“ بھی منتخب ہو گیا اور سنہ ۱۸۲۸ ع میں ”ایم لبرون“ بھی رکن بنا لیا گیا اور اگر ”برین جر“ نے مقابلہ سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور ہی منتخب ہو جاتا۔

————— ۱۰ —————

اپریل سنہ ۱۸۳۰ ع میں ”یم۔ دی۔ لامارتین“ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا کیوں کہ اس نے ثابت کر دیا کہ خواہ ظاہری طور پر نہ سہی لیکن باطناً مجلس علمی بھی اس جدید مذہب کے لائق اور باکمال افراد کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جیسا کہ خود ”لامارتین“ نے اپنی تقریر میں کہا ”اس انتخاب سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مجلس مشاہیر عصر میں سے کسی کو بھی رکنیت سے محروم رکھنا نہیں چاہتی“ اور یہ کہ اُس کے دروازہ بلا قید مذہب تمام اہل علم کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ کچھ عرصہ کے بعد ”وگٹر ہیوگو“ بھی رکن بنا لیا گیا۔ حالانکہ کچھ دنوں پہلے اُس کے ذاتک ”ہرنانی“ پر ہر طرف سے شدید مباحثے و مناظرے ہوتے رہے تھے۔ پرانے نظام سلطنت کے بگڑ جانے کے بعد سے سرپرست کے عہدہ کی کچھ زیادہ قدر نہ رہی تھی لیکن اور حیثیتوں سے آج کی مجلس علمی ویسی ہی ہے جیسی کہ ”ری شی لیو“ نے قائم کی تھی اور جو کہ لوئی چہار دہم کے زمانہ میں معراج کمال پر پہونچ گئی تھی۔ حسب دستور اسکے اجلاس پورے سال بھر ہفتہ میں ایک مرتبہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ مجلس کسی قسم کی کوئی تعطیل نہیں مناتی۔ تقسیم انعامات کے زمانہ میں ہفتہ میں دو مرتبہ اجلاس ہوتا ہے۔ جس مجلس کی ابتدا اتنی حقیر تھی اور جس کے اراکین غریب اور معمولی حیثیت کے اہل علم تھے وہی مجلس آج نہ صرف ایک زبردست علمی جماعت ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ بہت کچھ دولت مند اور بااثر بھی ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کے نام کو افتخار عظیم

چھوڑے ہیں۔ اس میں بہت کچھ انعامات بھی تقسیم کئے جاتے ہیں اور ان کی ہر شخص کو آرزو رہا کرتی ہے۔ ہر فرانسیسی اہل علم اسکے مشہور گنبد * کے نیچے جگہ پانے کو علمی شہرت کی معراج تصور کرتا ہے۔

—:O:—

آغاز قیام مجلس سے لے کر موجودہ زمانہ تک اس کی تاریخ دیکھ لینے کے بعد اب ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ کیا اس کے منشاء قیام کی تکمیل ہو چکی ہے؟ کیا آج بھی یہ اُسی شہرت کی حقدار ہے جو اسے قدیم زمانہ میں حاصل تھی؟ کیا اُس نے کچھ مفید خدمات انجام دیں اور اب بنی دے سکتی ہے؟ مخالفین کے حملوں کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ ان سب سوالات کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ اس انجمن کے قیام کے بعد ہی سے فرانسیسی زبان نے ترقی شروع کی اور رفتہ رفتہ وضاحت معانی۔ آب و تاب۔ صحت اور فصاحت کے اعتبار سے نیز سلاست کے ساتھ اظہار خیال پر قادر ہونے کی حیثیت سے اس زبان کا شمار بہترین السنۂ جدیدہ میں ہونے لگا اور آج بھی ہوتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اسی مجلس علمی کی بدولت ادبیات اور ادیبوں کو جو پہلے کس میسرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ بلند ترین رتبے اور عزتیں حاصل ہوئیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسی کے اثر سے ملک کے اعلیٰ طبقوں میں علم کی وقعت اور محبت پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ اس مجلس نے ان لوگوں کی سرپرستی اور مدد کی جن کی ذہانت پردۂ گہنامی میں چھپی ہوئی تھی اور جو اُس کی دستگیری کے بغیر یا تو عمر بھر بے دست و پا رہتے یا پھر

* سنہ ۱۸۰۸ء سے مجلس علمی کے جلسے قدیم قصر مازارین میں ہوتے ہیں۔ یہ

مشہور گنبد اسی قصر کے اوپر ہے۔

ناچار خدایان سلطنت کے دروں کی خاک اُڑاتے اور اُن سے مدد کے طالب ہوتے۔

—:0:—

لیکن ان سب باتوں کے باوجود مخالفین کے اکثر حملوں کو حق بجانب ماننا پڑتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس مجلس میں بے جا اعتراض اور تنقید کی روح موجود رہی ہے جس نے بجائے زبان کو ترقی دینے کے بعض صورتوں میں اُسے سرمایۂ علمی سے معروم رکھا ہے۔ یہ مجلس پسندیدہ سے پسندیدہ اختراع اور ایجاد سے خائف رہی ہے گویا کہ اس کی علمی شان اور بزرگی کو اُسے تسلیم کرنے سے کسی قسم کا ضرر پہونچے۔ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس نے بادشاہوں اور وزیروں کے سامنے بھی بعض اوقات سر اطاعت خم کیا ہے اور اکثر صورتوں میں یہ اطاعت غلامی کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ اس کا بھی ہم دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اُس کے انتخابات میں ہمیشہ حق و قابلیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ ایسی مثالیں بھی نظر آتی ہیں جن میں مستحق افراد کو رکنیت سے معروم رکھا گیا ہے۔ کبھی کبھی رائے دینے میں خانگی سازشیں اور سیاسی مصلحتیں علمی استحقاق و استعداد پر غالب آئی ہیں۔ لیکن ان سب اور ان سے بھی زیادہ اعتراضات کو بھی اگر تسلیم کر لو تو بھی اچھائیوں کا پہلہ برائیوں کے مقابلہ میں بھاری نظر آتا ہے اور ایسا ہونا ممکن ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے کیوں کہ اس مجلس کی تاہائی سو سالہ زندگی میں فرانس کے اعلیٰ ترین دماغ اس میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ ایسے ایسے خداداد ذکاوت اور جودت رکھنے والے افراد اس کے رکن ہوئے ہیں جن کا پایہ تقریباً علم کے ہر شعبہ میں نہایت بلند تھا۔ جس مجلس کے ایسے اعضاء اور ارکان ہوں وہ لازمی طور پر اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ چنانچہ یہ مجلس بھی حقیقی معنوں میں اعلیٰ ہے۔ اُس کے افراد نرے ذکی اور ذہین ہی نہ تھے بلکہ وہ دیانت دار۔ مخلص اور عالی ہرث بھی تھے۔ وہ جری بھی تھے

اور اپنی جرات کا استعمال مجلس کی آزادی کی حمایت میں کرتے رہے۔ یہی سب باتیں ہیں جنہوں نے مل جلکر اس مجلس کو اعلیٰ بنادیا ہے۔ مجلس علمی کے جدید ترین مورخ فابرے کے بقول ”فرانسیسی مجلس علمی نے بہت سے طوفانوں کے تھپیڑے سہمے ہیں اور بہت سے انقلابات اور سیاسی اُتار چڑھاؤ سے بچ بچ کر نکلتی رہی ہے اور ہم کو پوری اُمید بلکہ یقین ہے کہ جب تک فرانسیسی قوم زندہ ہے یہ مجلس بھی زندہ اور قائم رہے گی۔“

————— (۰) —————

یکم مئی سنہ ۱۸۹۰ ع کی تاریخ اس لئے مقرر کی گئی تھی کہ ایم۔ ایچیلی آڈیر مشہور ڈراما نویس کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اُس پر کسی نئے رکن کا انتخاب عمل میں آئے۔ مازارین کے گنبد کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے اتنی سخت جنگ شاید پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی اور شاید پہلے کسی خالی جگہ کے لئے اتنے اُمید وار میدان میں نہ اُترے ہوں گے۔ تیسرے افراد ایک جگہ کے لئے مقابلہ کر رہے تھے !

اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ ریشی لیو کی موصی یا کسی بادشاہ وقت کا حکم مجلس کے انتخابات پر اثر ڈال سکے۔ اب تو صدر جمہوریت کسی طرح کا دخل نہیں دیتا۔ ہاں سیاسی وجہ یا اور دوسرے اسی قسم کے اسباب اب بھی اراکین مجلس میں تفرقہ ڈال دیا کرتے ہیں۔ دادے کا مشہور افسانہ ”غیر فانی“ کہیں کہیں سے پردہ ہٹا کر ہمیں پس پردہ حالات کی ذرا سی جھلک دکھا دیتا ہے اور اگرچہ اس قصہ میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے پھر بھی اتنا یقینی ہے کہ ہر انتخاب کے موقع پر سازشوں کی گرم بازاری ہوتی ہے اور رایوں پر بہت سے اثرات ڈالے جاتے ہیں۔ جس یکم مئی کا ہم نے ذکر کیا اُس دن یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی تھی۔ میدان مقابلہ خوب گرم تھا اور عرصہ تک گرم رہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ انتخاب کے لئے ضروری تھا

کہ کم از کم بیس رائیں (یعنی نصف مجلس سے ایک زیادہ) حاصل کی جائیں اور کسی ایک امیدوار کو بھی اتنی رائیں نہ مل سکیں۔

چونکہ جنگ کی شدت کا اندازہ پہلے ہی سے سب کو تھا اس لئے جملہ اراکین اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ اُنٹالیس ”غیر فانیوں“ میں سے صرت ایک یعنی دیوک آمیل موجود نہ تھا کیوں کہ وہ اُس وقت سسلی میں تھا۔ ایم ری نین بھی لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنی رائے دینے آگئے تھے۔ حالانکہ شدید وجع مفاصل میں گرفتار تھے۔ لیکن غیر حاضر رہنا انہیں کس طرح گوارہ ہو سکتا تھا۔ تھپک ایک بچے جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے معتمد مجلس علمی نے وہ خط پڑھ کر حاضرین کو سنائے جو تیسرے امیدواروں نے مجلس کے نام لکھے تھے۔ پھر قدیم دستور کے موافق حاضرین کو ہدایت کی گئی کہ جملہ رائیں ”کامل آزادی اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے“ دی جائیں۔ رائیں لی گئیں۔ سات مرتبہ رائیں لی گئیں۔ لیکن نتیجہ ہمیشہ وہی رہا یا یوں کہو کہ کچھ نہ رہا۔ کیوں کہ کسی مرتبہ بھی کسی امیدوار کو دس سے زیادہ رائیں نہ مل سکیں۔ ساتویں مرتبہ راے طلب کر لینے کے بعد جب ناظم مجلس نے دیکھا کہ جلسہ کو مزید طول دینا فضول ہے تو اُس نے تجویز کی کہ انتخابات کی تاریخ بڑھادی جائے اور یہ تجویز بالاتفاق راے منظور ہوئی۔

—————:O:—————

امیدواران رکنیت میں تنوع کی کوئی کمی نہ تھی۔ مقابلہ کرنے والوں میں صرت مورخ اور ادبی نقاد ہی شامل نہ تھے۔ بلکہ افسانہ نگار شعرا۔ سائنس دان۔ ڈراما نویس سب ہی تھے۔ بعض زبردست استعداد رکھتے تھے۔ بعضوں کا مبلغ علم معمولی تھا۔ کچھ ایسے بھی حضرات تھے جن کے نام سے خود فرانس میں بھی زیادہ لوگ واقف نہ تھے۔ مشہور امیدواروں میں ایم زولا بھی تھا۔ اکثر لوگوں کو تعجب بھی ہوا کہ اُس نے ”غیر فانیوں“ میں شامل ہونے

کا خواب کس طرح دیکھ لیا! اُس کی تصانیف کے حسن و قبح سے تو ہم کو کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے ہاں اتنی بات مسلّمہ ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی تو ایسی نہیں ہے جو علمی کہی جاسکے! —

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کی آخری تصنیف سے پہلے کی کتاب یعنی Le Reve "خواب" مجلس علمی کے اعزازات حاصل کرنے کے خیال سے لکھی گئی ہے۔ جو کچھ بھی ہوا اتنا ضرور ہے کہ اس کی مذکورہ بالا تصنیف اور دوسری تصانیف کے درمیان وہی فرق ہے جو دن رات۔ نور اور ظلمت میں ہوتا ہے۔ ایک موقع پر جب ایم زولا کے کسی دوست نے اُس سے دریافت کیا "آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو کوئی موقع ہے؟" تو اُس نے جواب دیا "یہ تو میں جانتا ہوں کہ مجھے اس مرتبہ کسی قسم کا موقع نہیں ہے۔ لیکن میں نے مستقل رہنے کی نیت کر لی ہے اور آخر میں مجھے کامیابی کی اُمید بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو خاص کر ہر صاحب فن کو اُن تمام ممکنہ اعزازات کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جن کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہو۔ ہم سب کے لئے مجلس علمی میں جگہ پانا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز ہے اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اُس کے لئے ضرور کوشش کروں گا" —

—:O:—

انہیں امیدواروں میں ایک اور افسانہ نگار پیری لوتی بھی تھا۔ اس کی تصنیفات میں ہمدردی کا رنگ بہت گہرا جھلکتا ہے۔ وہ ایک قدیم ہیوجی فات خاندان کا رکن ہے۔ جس نے کئی صدی قبل جزیرۂ اوبی ران میں پناہ لی تھی۔ ہم اُسے "بحری شاعر" کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ باعتبار عہدہ وہ ایک بحری افسر ہے * —

* ابھی حال ہی میں پیری لوتی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس مصنف کو ترکوں سے (باقی صفحہ آئندہ)

اجنبی سرزمینوں اور دور دراز سمندروں سے۔ ہر اُس جگہ سے جہاں اس کی بحری زندگی کے انقلابات اور اتفاقات اُسے لے گئے ہیں وہ سوغات کے طور پر ایسی یاد اور ایسے ایسے بیانات محفوظ کر کے لایا ہے جو اپنے اچھوتے پن اور اپنی دکھ بھری رقت کی وجہ سے بہت دلکش ہیں۔ اُس کی تازہ ترین تصنیف "Le Roman en Enfant" (ایک بچہ کا افسانہ) میں ہمیں پرانے ہیوجی فانت خاندانوں کے مرقع نظر آتے ہیں جو ہو بہو سترھویں صدی کے کسی انگریز خاندان کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ انجیل کا پرانا خاندانی نسخہ جسکو یہوتے بڑے سب بہت احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ فرشتہ صورت والی عسخت گیر بھی ہے اور رحم دل بھی اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا بیان یہاں رقت اور لطافت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک نہ ایک دن لوتی ضرور چالیس کے مجمع میں نظر آئے گا لیکن اس مرتبہ نہیں! —



ایک اور اُمیدوار ایم برونی تییر تھے۔ یہ ایک زبردست نقاد ہیں۔ رسالہ Revue des deux Mondes میں ان کے مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں اور بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن جو دو اُمیدوار رکنیت کے لئے سخت مقابلہ کر رہے تھے وہ ایم لادیسلی اور ایم تھیوروتانگن تھے۔ یہ دونوں کے دونوں اعلیٰ پایہ کے مورخ ہیں۔ اول الذکر سو ربوں میں تاریخ کے پروفیسر ہیں اور تاریخی مباحث پر قابلیت کے ساتھ قلم اُٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں با اثر دوستوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔ جنہوں نے کہ ان کی کامیابی کے لئے

بہت محنت تھی اور اکثر ایڈلی ناولوں میں اس نے اُن کی معاشرت کی تصویریں دکھائی ہیں۔ اس کی کچھ ناولوں کا ترجمہ فارسی میں بھی ہو چکا ہے "پرہرویان نکام" ایسا ہی ترجمہ ہے۔ اس کی دوسری ناولیں یہ ہیں: - Le Mariage de Loti; Mon Frere Ives; Propos d' Exil; Madame Chrisantheme.

کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن تھیوری و دانگی کے حقوق ایم لادیسے سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ کئی سال سے اُنکی حیثیت ہونیوالے رکن مجلس کی سی تسلیم کی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی تمام خدمات اُنہیں ہر طرح سے اس اعزاز کا اہل بناتی ہیں۔ ”ماہ جولائی کی شہنشاہیت کی تاریخ“ اُن کی خاص تصنیف ہے اور اُنہیں ممتاز مورخوں کی صف میں شامل کر دیتی ہے۔ صرف فصاحت اور زبان کی دلکشی ہی اس تصنیف کی خوبیاں نہیں بلکہ دیانت۔ غیر جانبدارانہ نظر اجتہاد و آزادی آرا بھی اس کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔

—:0:—

مذکور بالا امیدواروں کے علاوہ عین انتخاب کے وقت رکنیت کے ایک اور امیدوار پیدا ہو گئے۔ یعنی ایم تی فرے سینے وزیر اعظم و وزیر جنگ فرانس اُن کی کامیابی شروع ہی سے یقینی سی ہو گئی۔ کیونکہ ادبی قابلیت کے علاوہ خود اُن کے عہدہ کا اثر کمزور تھا۔ مختصر یہ کہ گیارہ دسمبر کو دوبارہ انتخاب ہوا اور ایم فرے سینے کو رایوں کی مقررہ تعداد مل گئی یعنی نصف سے ایک زیادہ۔ حاضر الوقت اراکین کی تعداد ۳۸ تھی اور اُن میں سے ۲۰ نے اُن کے موافق رائیں دیں۔ ہم اتنا اور بتلائے دیتے ہیں کہ ایم فرے سینے کا ”توشعہ علمی“ * نہ تو بہت بھاری ہے اور نہ کچھ زیادہ اہم۔ کچھ رسالے علمی مباحث پر ہیں اور شاید ایک کتاب ہے جو سنہ ۱۸۷۰ ع کی جنگ کے بعد لکھی گئی تھی۔ اس آخر الذکر تصنیف کی بہت کچھ تعریف کی جاتی ہے۔ کم از کم اُن کی جماعت کا یہ خیال ہے کہ ایم۔ فرے سینے کچھ ملکی اور عام خدمات کی بجآوری کے بھی دعویدار ہو سکتے ہیں۔ مجلس علمی کے دروازے ہمیشہ

* امیدواروں کی تصانیف اور دیگر علمی خدمات اسناد و فہرہ کو مجموعی طور پر اُن کا Literary Bagol کہا جاتا ہے۔

خدمت عامہ کرنے والوں کے لئے کھلے رہے ہیں۔ خواہ یہ خدمت قلم کے ذریعہ سے
کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

—§—

مجلس علمی کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس کا افتتاح
مناسب ساعت میں کیا گیا۔ اُس نے کسی حد تک فرانسیسی زبان کو معین کر دیا ہے
اور ادبیات پر بھی اُس کا اثر کچھ معمولی نہیں ہے۔ سرور زمانہ اور روایات نے
فرانسیسی ادیبوں کے لئے اس کی رکنیت کو ایک قابل آرزو چیز بنا دیا ہے۔
لیکن اس رکنیت سے علمی فائدہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ مقبولیت اور عام
راے بھی اُس کی شریک ہو۔ انگریزی ادب بجا طور پر یہ فخر کر سکتا ہے کہ اگر
کوئی بڑی سے بڑی مجلس علمی بھی قائم کی جائے تو بھی اُس میں ان انگریزی
ادیبوں کی سہائی نہیں ہو سکتی جو بجا طور پر رکنیت کے مستحق ہیں۔ انگریز
مصنفین بغیر غور و قائل کے اپنے آزادانہ شریف اور ہمہ گیر پیشہ کو کسی
ایسی مجلس کا پابند نہیں بنا سکتے جس کا مقصد حیات صرت ”جگر بندی“ اور
تحدید ہو اور اگر ایسی مجلس قائم بھی ہو جائے تب بھی ہمارا موجودہ ادب
جس حالت میں ہے اُس کے اعتبار سے ایسی مجلس صرت خارجی وقار اور
ظاہری عزت کا ذریعہ ہو سکتی ہے اور بس۔



جیت کی کنجی

از

(جذاب محمد عظمت اللہ خان صاحب)

ہے ایک پھیلی اپنا جینا ایک معہ مر جانا
اک راز یہاں کا آنا جانا
خون جگر پینا بوجھنا اس کا مفت کا گویا غم کھانا
آخر یہی جانا کچھ نہیں جانا

—(•)⊙—

زیست کے معنے ہیں درد کا سہنا سکھ کا اُٹھنا مردانا
دُر کا کچل دینا دُر کا مٹانا
جان ہتھیلی پر رکھنا جینا ہارنا جی کا مر جانا
جان کا کھو دینا جان کا پانا

—(•)⊙—

سکھ کا منشا ہے بس اتنا ہی سکھ کام کی ہے تیاری
سکھ سے تازہ دم کام کے قابل
دن بھر کام کا پھل رات کی نیندیں نیند کا ٹھہرہ بیداری
سکھ یا دکھ یکساں سم قاتل

—(•)⊙—

دکھہ اک سکھشا ہے بن دکھہ جان کو آرام نہیں چیں نہیں
 سکھہ خواب ہے گویا دکھہ بیداری
 ہر کام میں دکھہ ہے دکھہ میں سکھہ ہے گر کام نہیں چیں نہیں
 ہے کام کی جگ میں برکت ساری

— (•) —

کام عبارت ہے سرگرمی سے کام دماغی بجلی ہے
 اس زور سے ہر مشکل ٹلتی ہے
 سارے زور کا زور نہیں ہے یہی جیت کی کلجی ہے
 کام سے دنیا آگے چلتی ہے



ادبیات ایران در زبان مشروطه

(ذیل کا مضمون ایران کے مشہور اہل قلم رشید یاسسی کا لکھا ہوا ہے۔
 رشید ایک روشن خیال پرجوش نوجوان ہیں اور ایرانی ادبیات
 میں ان کی حیثیت متعدد کی سی ہے۔ آپ کو قدمائے ایران کے
 ساتھ بھی بہت محبت ہے۔ آپ صاحب تالیفات بھی ہیں جن میں
 تذکرہ ابن یسین خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ کی فارسی نثر
 ایک مخصوص انداز رکھتی ہے۔ رشید شاعر بھی ہیں اور انکی نظمیں
 ایرانی ادبیات میں وہی درجہ رکھتی ہیں جو اقبال کا اردو نظم
 میں ہے۔ ہم آقا مہرزا محمد تقی صاحب علمی شیرازی پروفیسر
 اورنگ آباد کالج کے مسنون ہیں جنہوں نے اپنی عنایت سے یہ
 مضمون رسالہ اردو کے لئے لکھوایا۔ ترجمہ کے مقابل اصل فارسی
 تحریر بھی درج کر دی گئی ہے تاکہ زمانہ حال کے ایک نامور ایرانی
 ادیب کی انشا پر دانی کا نمونہ معلوم ہو جائے۔

مولوی سید وہاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج نے
 ازراہ عنایت اس کا ترجمہ اردو میں کر کے دیا ہے۔

(ادبیت)

امروز عہد تحول زبان فارسی	آج وہ زمانہ ہے کہ فارسی زبان
ہست ایرانیان پس از آشنائی بہ	اپنا چولا بدل رہی ہے۔ یورپی ادبیات
ادبیات اروپائے احتاج بہ یک تعبد	سے واقف ہو کر اب ایرانیوں نے بھی

یہ محسوس کر لیا ہے کہ اُن کی ادبیات میں پوری طرح تبدیلی ہونا چاہئے۔ آدمی جب تک اپنی عادتوں اور رسموں میں پھنسا رہتا ہے ان چیزوں کی برائیاں نہیں سمجھ سکتا اور نہ اپنی خامیوں کے دور کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

یورپ نے خواہ اُس کا طریقہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ کہا جائے لیکن پھر بھی بہت کچھ قابل توجہ پیرایہ میں ایرانیوں کو یہ بات سچائی کہ انشا پر دازی سے مراد صرف کلمہ بازی اور لفاظی ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ نیز یہ کہ الفاظ کی رعایت سے پہلے (جن کی حیثیت محض قالب بے روح کی سی ہے) لکھنے والے کو معافی پر توجہ کرنی چاہئے۔ ایران کی قدیم ادبیات اسی راستہ پر تئی تھی اور خود ایران جدید بھی اگرچہ جدت پسندی پر آمادہ تھا اور بظاہر یورپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا لیکن اصولاً اپنے پرانے بزرگوں کی پیروی کرتا تھا اور انہیں کی دکھلائی

کاملے را احساس نمودند۔ شخص تا معذور عادات و رسوم خود هست هیچ نمی تواند عیوب آنها را فہمیدہ و در رفع نواقص خود کوشش نہاید۔ اروپا ہر چند بطور خیلے ناقص ولے باز تا درجۂ قابل توجہی بایرانے فہماید کہ غیر از کلمہ بازی نوعے دیگر ہم از چیز نویسی وجود دارد و قبل از رعایت الفاظ کہ قالب ہاے بے روح ہستند توجہ بمعانی باید منظور نویسندہ باشد ادبیات قدیم ایران بر این خط سیر نمودہ و ایرانے در حالتے کہ تجدید میکرد و ظاہرا اروپا را سر مشق خود قرار میداد اصولاً پیروی از بزرگان قدیم خود کردہ و بر طریقہ آنها سلوک می نمود فاصلہ چہار صد سال کہ میان آن عہد و این دورہ واقع بود البتہ بسہولت طے نمی گشت ادبیات صفوی و زند و قاجار بآسانی فراموش نمی شد ناچار میان فکر جدید خواہی و عادت قدیم پرستی یک جداول تسکین فایزیرے دوام یافت۔

ہوئی شاہراہ پر گام زن تھا۔ قدیم و جدید عہد کے درمیان جو چار سو سال کا فاصلہ حائل تھا وہ آسانی سے کیونکر طے ہو سکتا تھا۔ صفوی۔ زند اور قاجار کے عہدوں کی ادبیات کو بھول جانا آسان نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدت پسندی کے رجحان اور قدامت پرستی کی عادت کے درمیان ایک ابدی جنگ چھڑ گئی۔

—:O:—

انشاپردازوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آیا جس نے اپنی تصنیفات سے سجع مراعات النظر اور تہام پابندیوں کو نکال پھینکا۔ انشاپردازی بیان معانی کی مراد قرار پائی اور الفاظ پر توجہ کرنا اور جملوں کو سنوارنا متروک ہو گیا۔ لکھنے والے پہلے یہ سوچتے کہ کیا لکھا جائے اور پھر اُسے بیان کرنے کے لئے کلیے تھالے جاتے اور یہ طریقہ قدیم روش کے خلاف تھا۔

اس دور تکون میں جو سب سے بڑا عیب پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہر

یک دستہ از نویسندگان در آثار خود قید سجع و مراعات النظر و سایر قیود را در ہم شکستند نویسندگی عبارت شد از بیان معانی و توجہ بالفاظ و زینت جملہ متروک ماند یعنی نویسندہ اول فکر می کرد چہ می خواہد بنویسد بعد کلمات برائے بیان آنها استحضام می نمود و این برخلاف رویہ سابقین بود۔

عیب بزرگے کہ دریں تجدید پیدا شد این بود کہ مثل ہمیشہ و ہمہ جا زمام نویسندگی بدست جوانان افتاد کہ متأسفانہ و طبیعاً از معلومات گذشتہ و نگارش پیشین چندان اطلاع نداشتند فضلا و ادبائے کہ در ادب ماضی دست داشتند پس یک مقاومت مایوسانہ مغلوب شدند و گوشہ گرفته و با چشمے منتقد و ناراضے بقلم جوانان نگران شدند طبقہ جوان ہم کہ یکبارہ بر ادب گزشتگان پشت پا زدہ و بر خود حتم کردہ بود کہ لفاظی را مہمل گذاشتہ و معانی را با سائی ترین عبارتے بیان کند و چارہ و مشکل شد

طریقہ فرمولی نظم و نثر قدیم کہ
زیبائے ظاہر داشت از پوشیدہ ماند
و برائے پوشاندن معانی بفقر مبرمی
مبتلا گشت و معانی نیز کہ مطمح نظر
بود متاسفانہ بیک خواہش عاشقانہ
نصیب او نہی شد محتاج بسعی و صبر
و صرت عمر بسیار بود و بدیہی است
کہ ایں سہ عامل کہتر در دسترس
جوان می آید —

اروپائے کہ او را مفتون میکرد
فقط یک آئینہ بود کہ اشعۂ خورشید
علم را بطور مبہم و خیرہ کنندہ بچشم
او میفرستاد و حقائق را در حجاب
نور شدید از نظر او مخفی میداشت —
جوان نہ گزشتہ را لایق پیروی
می دانست و نہ از اردپا می توانست
چنانکہ باید معانی و علوم اخذ
نہاید و قتنے کہ رشتۂ الفاظ گسیختہ
شد و فکر نویسنده را نہ سبع مدد
کرد و نہ معانی را ہنماے نمود معلوم
ہست چہ اغتشاشی رخ خواہد داد
دیگر نہ معانی فارسی ماخوذ از اروپا
لفظ متناسبے پیدا کردند و نہ الفاظ

زمانے اور ہر جگہ کی طرح ایران
میں بھی تصنیف و تالیف کی باگ
جوانوں کے ہاتھوں میں آگئی جو
قدرتی طور پر معلومات گزشتہ اور
زمانہ سابق کی تحریروں سے کچھ
زیادہ باخبر نہ تھے۔ وہ فاضل اور
ادیب بزرگ جن کو قدیم ادب میں
دسترس حاصل تھی مایوسانہ مقابلہ
کے بعد ہار مان گئے اور اس میدان
سے الگ ہت کر غصے اور عیب جوئی
کی نگاہوں سے نوجوانوں کے قلم کو
دیکھنے لگے۔ اس طبقہ کو جس نے
دفعۃً ادبیات قدیم کو ٹھکرا دیا تھا
اور لفاظی کو مہمل سمجھنے اور
مطاب کو آسان ترین عبارت میں
بیان کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا دو
دقتوں کا سامنا کرنا پڑا: —

ایک طرف تو قدیم نظم و نثر
کا تہلا تہلایا طریقہ جو ظاہری
زیبائش رکھتا تھا اُن کی نظروں سے
چھپ گیا اور وہ اپنے مطالب کے اباس
کے بارے میں زبردستی فقیر بن کر
رہ گئے او دوسری طرف افسوس ہے

کہ اُن کے حسب مقصد مطالب بھی محض عاشقانہ آرزو سے حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ اُنہیں حاصل کرنے کے لئے کوشش، صبر اور بڑی عمر صرف کرنے کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں عامل جوانوں کے قبضہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔

جس یورپ نے جوانوں کو رجھا لیا تھا فقط ایک ایسا آئینہ تھا جو آفتاب علم کی شعاعوں کو مبہم اور خیرہ کن بنا کر اُن کی آنکھوں پر ڈالتا تھا اور جس نے تیز روشنی کا پردہ ڈال کر حقائق کو اُن کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

نوجوان نہ تو گزشتہ ادبیات کو قابل پیروی سمجھتے تھے اور نہ جیسا کہ چاہتے یورپ ہی سے معافی و علوم اخذ کر سکتے تھے۔ جب الفاظ کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور لکھنے والے کی مدد کے لئے نہ تو سجع ہی موجود ہوتا ہے اور نہ مطالب ہی اُس کی ہدایت کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کیا کچھ سیل اور آمیزش پیدا نہیں ہوتی

بہ تسلسل طبیعی و عادی خود عود نمودند چہ بسا افکار تازہ و بدیع کہ از فارسانی الفاظ مستور ماندند؛ و چہ بسا الفاظ زیبا کہ بعلت تزلزل معانی بے تاثیر شدند؛ ادبیات ایران بیک خرمن کو بیدہ شبیہ گشت کہ داندہا را یک مرض بناتے بیمعز کردہ باشد بقسمے کہ ہر چند در ظاہر ہیکل خرمن اُمید بخش و چشم پر کن باشد پس از باد دادن و جدا کردن کاہ ہیچ چیز مثبت و مفیدے بدست دہقان نہی رسد۔

متجددین با تعجب و تاسف برین پیش آمد نگاہ می کردند و با وسایل کہ بے مطالعه بعہل گزاشته می شد ندا کارانہ در تداوی این بیمار مبادرت میورزیدند از استعمال الفاظ اروپائی افراط کردند نہ تنہا ازین جہت کہ از الفاظ مناسب زبان خویش غفلت داشتند بلکہ باین اُمید کہ در الفاظ اروپائی یک اثر فوق العادہ موجود باشد انہاسی دیدند کہ ہمیں الفاظ در آن قطعہ دنیا آثارے عجیب

پھر نہ تو یورپ سے مستعار لئے ہوئے فارسی مطالب اپنے مناسب الفاظ ہی پیدا کرتے تھے اور نہ الفاظ اپنے فطری اور بندھے ہوئے تسلسل کے ساتھ ذہن میں ابھرتے تھے۔ کیسے کیسے تازہ خیالات معض الفاظ کی نارسائی کی وجہ سے چھپے رہے! اور کتنے ہی خوبصورت الفاظ مطالب کے تزلزل کے باعث بے تاثیر رہ گئے! ایرانی ادبیات کی حالت اُس خرمی کی سی ہو گئی جس کے دانوں کو گھن لگ گیا ہو یعنی جو بظاہر تو خرمی کی صورت رکھتا ہے اور دیکھنے میں بھرا پرا معلوم ہوتا ہے لیکن پھٹکنے کے بعد سوائے بھوسے کے کوئی مفید اور کام کی چیز دھقان کے ہاتھ نہیں لگتی۔

جدت پسندوں نے اس نقی افتاد کو تعجب اور افسوس کے ساتھ دیکھا اور اُن وسائل سے کام لیکر جن پر بغیر غور و خوض کے عمل کر لیا گیا تھا۔ تذہبی کے ساتھ اس بیہار کے علاج کی کوشش کرنے لگے۔ اُنہوں نے یورپی الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنا شروع کیا

میکنند و لمعانی انما در زبان فارسی بے رنگ و بے اثر می مانند پس ہان الفاظ را عین بکار بردند تا از تاثیر ساحرانہ انما ادبیات روحے بگیرد لیکن علاوہ ہر ضررے کہ و دود لغات اجنبی بر زبان فارسی می رسایند مسلم شد کہ در لفظ بے سابقہ و بے رابطہ باتھام جملہ ہیچ اثرے نہ ساحرانہ و نہ عادے سر جود نیست و بنا بر قول قدما بہ تحقیق رسید کہ : ع :

”ہر چیزی بجائے خویش نیکوست“

—:۱۰:—

ترجمہ شروع شد۔ ولے دریک دائرہ تنگے کہ از حدود قصہ و ادبیات ابتدائی ملل اروپا تجاوز نہی کرد یعنی حدے کہ الفاظ عادی و رائج برائے تعبیر و ترجمہ اُن کفایت کند و احتیاج بہ لغات و اصلاحات عالیہ نیفتد۔

این توجہ معتقدانہ باروپاے سطحی و امراض از گزشتہ ادبے در ایران هنوز دوام دارد فقط یکدستہ درین سالہاے اخیر آشنائی

باروپا را بدرجہ صمیمیت رسانیدہ و بیش از سایرین باعلاق آن فرورفتہ و درہمان وقت بگزشتہ ایران نظرے بے تنفر انداختند و سعی کردہ اند حقایقے را کہ متجددین صدر مشروطیت از شدت حرارت تجدید خواہی نمی دیدہ اند کشف کردہ آشنائی قطع شدہ را بازبان خود محکم سازند یعنی ہم اروپا و ہم ایران قدیم را بانظر صرافانہ بنگرند از ظاہر زیبای اروپا خیرہ نمی شدند و از صورت پرچین ادبیات ماضی مایوس و رمیدہ نگردند بہ بینند حقیقت امر کجاست؟ برتری دبی اروپا گزشتہ از تحمل درچہست؟ و ہستی ادب ایران غیر از پیری و غیر از لباس زندہ درجہ؟

این طبقہ از متجددین کشف کردند کہ ادبیات ایران این قدرہا محکوم و سزاوار مغفوریت نیست۔ کتب قدیمہ فراموش شدہ بہا نشان می دہند کہ پیش از دورۂ لفاظی این چہار صد سال

اُس کی وجہ صرف یہی نہ تھی کہ وہ خود اپنی زبان کے مناسب الفاظ سے ناواقف تھے۔ بلکہ انہیں یہ اُمید بھی تھی کہ یورپی الفاظ میں ضرور کوئی غیر معمولی اثر موجود ہوگا۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہی الفاظ اُس قطعہ دنیا (یورپ) میں عجیب اثر رکھتے ہیں لیکن فارسی زبان میں آکر اُن کے معنی میں وہ رنگ اور اثر باقی نہیں رہتا۔ لہذا اُنہوں نے وہی الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیئے تاکہ اُن کی ادبیات بھی اُن کے طلسمی اثر سے جی اُٹھے۔ اِن اجنبی لغات کی درآمد سے فارسی زبان کو جو ضرر پہونچا وہ ظاہر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُن پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہو گئی کہ انوکھے الفاظ میں جو پورے جملے کے ساتھ کوئی ربط نہ رکھتے ہوں کوئی طلسمی یا طبعی تاثیر نہیں پائی جاتی۔ اب انہیں قدما کے اس قول کی صداقت معلوم ہوئی کہ : ہر چیز بجاے خویش نیکوست۔

گزشتگان ما نظم و نثر طبیعی موثرے
 داشته اند کہ امروز نیز باوجود
 فراموش شدن سبک جملہ بندی
 و طرز ادائے معانی ہر کسے کہ اندک
 وقوفے بر ادبیات قدیم بیاید
 از خواندن آثار گزشتگان متاثر
 شود —

این اشخاص فکر کردند کہ اثر
 بخشی عمیق ترین خاصیت ادبیات
 است و برتری ادبیات مغرب زمین
 از ہمین اثرے کہ در روح می کند
 و از این نتیجہ گرفته کہ یک رویہ
 مشترک میان قدمائے ایران و اروپائے
 این قرن موجود است و آن متابعت
 از طبیعت و مطابقت با حقیقت است
 ہر گاہ کہ یک روحے نظماً یا نثراً
 سخن می گوید البتہ زبان او را روح
 ہائے دیگر می فہمد و متاثر می شوند
 و بالعکس ہر وقت زبانے بقوت لفاظی
 و فریب ظاہر سازی بخواہد بیان
 خود را کلام روح جلوہ دہد ابداً در
 ارواح شغوفندگان و خوانندگان
 اثرے نکرد و دروغش را فروغے

ترجمہ شروع ہوا لیکن اس کا
 دائرہ بہت تنگ رہا یہ اقوام یورپ
 کے افسانوں اور اُن کی ابتدائی
 ادبیات کی حد سے آگے نہ بڑھا۔
 یعنی اسی حد تک رہا جہاں تک
 کہ روزمرہ استعمال کے الفاظ تعبیر
 و ترجمہ کا ساتھ دیں اور اعلیٰ لغات
 اور اصطلاحات کی ضرورت نہ پڑے —
 سطحی یورپ کی طرف یہ عقیدت
 مندانہ توجہ اور ادبیات قدیم کی
 طرف سے بے اعتنائی ایران میں ابھی
 تک باقی ہے۔ صرف ایک گروہ ایسا
 ہوا ہے جس نے اس اخیر زمانے میں
 یورپ سے واقفیت پورے طور پر
 حاصل کر لی ہے۔ یہ لوگ دوسروں
 کے مقابلہ میں ادبیات یورپ کی تہہ
 میں بہت زیادہ دور تک گئے ہیں۔
 اس کے ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے
 ایران قدیم پر نفرت آمیز نظر
 نہیں ڈالی ہے۔ بلکہ اُن حقائق کو
 آشکارا کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں
 درمیانی عہد مشروطہ کے جدت پسند
 اپنی جدت پسندی کے جوش میں دیکھ

ہی نہ سکے تھے اور اس طرح سے اپنی زبان کے ساتھ محبت کی جو رسم قوت ٹٹی تھی اسے پھر استوار کیا ہے یہ یورپ اور ایران قدم دونوں کو نقادانہ نظروں سے پرکھتے ہیں اور نہ تو اس کی ظاہری زیبائش سے اُن کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں اور نہ اس کا جہریوں دار چہرہ دیکھ کر اس میں مایوسی اور وحشت پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ صرت یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت امر کہاں پائی جاتی ہے؟ دھرم دھام سے قطع نظر کر کے یورپی ادبیات کی فوقیت کس چیز کی وجہ سے ہے؟ اور پیری اور لباس کی کہنگی کو اگر خارج از بحث قرار دے لیا جائے تو ادبیات ایران کی پستی کی علت کیا رہ جاتی ہے؟

جدت پسندوں کے اس گروہ نے یہ بات دریافت کر لی کہ ایرانی ادبیات اس قدر معکوم اور لائق نفرت نہیں ہے۔ پرانی بھرلی ہوئی کتابوں سے پتہ ملتا ہے کہ اس چہار صد سالہ دور لغاهی سے قبل ہمارے

نظراہد بود و باز یکبار دیگر قول

پیشینیان را تصدیق کردند کہ : ع :

سخن کز دل بروں آید نشیند

لاجرم بردل —

—:0:—

چوں اروپا را بہتر شناختہ بودند

باقتند کہ در آنجا ہم ہر نویسنده

صاحب نفوذ در روح خوانندہ

نہی شود و معدودے ازو ہستند

کہ ترجمان کلام جانہا ہستند و میان

جانہا رابطہ گفتگو واقع می کردند

بیان تفاوتے کہ تعدد خواہان اول

دیدند ادبیات ما و خارجیان تشخیص

قدما فطری اور موثر نظم و نثر پر حاوی تھے اور آج بھی اگرچہ جہلوں کی لطیف بندش اور ادائے معانی کے طریقوں کو لوگ بھلا بیٹھے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شخص جسے قدیم ادبیات سے تھوڑا بہت بھی مس ہو جاتا ہے آثار قدما کے مطالعہ سے ضرور متاثر ہوتا ہے —

ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ کسی ادب کی انتہائی خاصیت یہ ہے کہ اُس میں اثر بخشی پائی جائے اور سرزمین مغرب کی ادبیات کی فوقیت کا سبب اس کا یہی اثر ہے جو روح پر پڑتا ہے۔ اس سے ان لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ قدماے ایران اور دور حاضر کے یورپی لوگوں میں ضرور ایک نہ ایک روش مشترک موجود ہے اور یہ ”پابندی فطرت اور مطابقت حقیقت“ ہے۔ جب کبھی کسی روح کی آواز نظم یا نثر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے تو ضرور ہے کہ دوسری روحیں اُس آواز کو سمجھیں اور اُس سے متاثر ہوں۔ برخلاف اس کے جب زبان یہ چاہتی ہے

دادہ اند کاملاً مصنوعی بودہ و مزایائی کہ از اروپا دیدہ و معایبے کہ در ادبیات ایران تمیز دادہ اند سطحی و در درجہ سوم و چہارم است

—:O:—

پس یکبار دیگر بایران عزیز خود توجہ کردند مانند غواصی کہ صید گاہ ترک شدہ خود را با زیاد در دریا فرورفته اروپا و ایران قدیم عمقاً عرصہ غواصی آنها شد و وفق دادن ادبیات این دو کشور منظور نظر آنها گشت —

—:O:—

کہ لغاطی کی قوت اور دکھاوے کے
فریب سے اپنے بیان کو کلام ووح بنا کر
پیش کرے تو اُس سے سامعین اور
ناظرین کی روجوں میں کبھی کوئی
اثر پیدا نہیں ہوتا اور اس کے دروغ
کو فروغ نہیں نصیب ہوتا۔ اس طرح
سے دوبارہ پرانے لوگوں کے اس قول
کی تصدیق ہوئی کہ —

ع: ”سخن کزدل بروں آید نشیند
لاجرم در دل“

اکنون تقلید کور کورانه اروپا
بواسطه کشف مزایای ادبیات قدیم
ایران رو بضعف نهاد و بدون انکار
فضل گذشتگان در اتخاذ برتری هـ
ادبی اروپا باحتیاط و نظر انتقاد
مداومت دارد —

چونکہ ان لوگوں نے یورپ کو
اچھی طرح سے جان لیا۔ تھا اس لئے
انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں
کے ہر مصنف کی دھاک پڑھنے والے
کی روح پر نہیں بیتھتی اور صرف
چند ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو
روحوں کی گفتگو کی ترجمانی کر سکتے
اور جانوں کے درمیان رشتہ گفتگو
قائم کر سکتے ہیں۔ اب ان کو معلوم
ہو گیا کہ جدت پسندوں کے پہلے
گروہ نے ہماری اور خارجی ادبیات
میں جو کچھ فرق نکالا تھا وہ تمام تر

باین طرز گمان می رود کہ ایران
قدیم ہر روز روشن تر گشتہ و طرز
ہائے فہمیدہ اروپا مانوس و موافق
تر با زبان ماسدہ بالاخرہ ادبیات
ایران در ہمیں نزدیک ہا ترکیبے
صحیح از ادبیات ہر دو کشور شدہ

مصنوعی تھا اور جو حلاوتیں انہوں نے
یورپ سے پائیں اور جو جو عیب
ایرانی ادبیات میں نکالے وہ سب
سطحی اور تیسرے اور چوتھے درجہ
کے ہیں۔

اب یہ لوگ دوبارہ اپنے محبوب
ایران کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس
غواص کی طرح جو شکار گاہ کو چھوڑ کر
اپنے آپ کو پھر دریامیں غوطہ لگانے
ہوئے دیکھتا ہے۔ یورپ اور ایران
قدیم کی گہرائیاں اُن کی غواصیوں کی
جگہ بنیں اور ان دونوں ممالک کی
ادبیات میں مطابقت پیدا کرنا اُن کا
مطمح نظر ہو گیا۔ اب چونکہ قدیم
ایرانی ادبیات کی حلاوتیں بھی
لوگوں کو معلوم ہو چکی ہیں اس لئے
یورپ کی کورانہ تقلید میں کمی
واقع ہوئی ہے۔ آج کل ادبیات یورپ
کی برتری ثابت کرنے کے لئے قدما کی
بزرگی سے انکار نہیں کیا جاتا اور
تقلید احتیاط اور نقادانہ نظر کے ساتھ
کی جاتی ہے۔

ان باتوں سے ہم قیاس کر سکتے

ہم موافق کہنہ برداشتہ گردد و ہم

معاسن جدید مستقر شود —

—:0:—

ایں تجدد اخیر بیشتر در نثر

روے داده و نظم ایران با جزئی

استثنایہ یا در حال قبل از مشروطیت

یعنی تقلید صورت و معنی قدما باقی

است یا در حالت تجدد ناقص اوایل

مشروطیت کہ گسیختگی کامل از قدیم

است در گردش و انقلاب است —

—:0:—

لیکن مسلم است کہ نظم نیز • ہیں کہ قدیم ایران نت نئی رونق

حاصل کرے گا یورپ کی پسندیدہ

بزدلے راۓ نثر را بیش گرفتہ واز روش بھی ہماری زبان سے زیادہ

مانوس اور اس کے مناسب حال ہوتی

ہر دو حال خارج شدہ رو بتکامل جائے گی اور رفتہ رفتہ دونوں ممالک

کی ادبیات کی آمیزش سے ادبیات

ایران کی ترکیب صحیح طریقہ پر

ہوسکے گی۔ اُدھر پرانی رکاوٹیں

دور ہوں گی اور ادھر جدید معائن

کا تعین ہوگا۔

خواہد نہاد۔

—:0:—

یہ آخری جدت زیادہ تر نثر میں

ہوئی ہے اور ایرانی نظم (مستثنیات

سے قطع نظر) یا تو اب تک ویسی ہی ہے

جیسی کہ مشروطہ سے پہلے تھی یعنی

قدما کی ظاہری اور معنوی پیروی

ہنوز باقی ہے۔ یا پھر آغاز مشروطہ کے

وقت جو ناقص حالت نکون تھی یعنی

روش قدیم سے پوری طرح علیحدگی

اُس میں پڑی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ

گردش و انقلاب میں ہے۔ لیکن یہ امر

یقینی ہے کہ عنقریب نظم بھی نثر ہی

کی شاہراہ پر پڑ جائے گی اور (افراط

و تقریط دونوں حالتوں سے علیحدہ

شعراے عالیقدرے دریں راۓ

اندیشہ می کنند و کارہائے آنہا تا

درجۂ قابل ملاحظہ شدہ است نام

بردن از آنہا و از نثر نویسانے کہ چہ در

ترجمہ و چہ در تالیفات خود تجدید را

تعدیل کردہ و زبان را قوام بخشیدہ

انداز موجب ریا میشود بہترین گواہ

آثار آنہاست کہ بر ہیچ جویندہ اے

ہو کر کہاں کو پہونچے گی۔ شعراے

عالمقدر اسی فکر میں ہیں اور اُن کے

کارنامے بہت کچھہ قابل ملاحظہ ہیں۔

پوشیدہ نمی ماند—

اُن کو اور اُن نثر نویسوں کو جنہوں نے

خواہ ترجمہ میں ہو یا ذاتی تالیفات

—: 0:—

میں جدت پسندی کے رجحان کو معتدل

بنایا اور ہماری زبان میں چاشنی

پیدا کی نام بنام بتلانا ریا پر محمول

کیا جائے گا۔ اُن کے بہترین گواہ خود

اُن کے آثار ہیں جو کسی تہووند ہنے

والے کی نگاہوں سے چھپے نہیں

رہ سکتے—

—: 0:—



خطبات گارسان دتاسی

(بقیہ خطبہ پنجم)

علاوہ ان فسانوں کے جو منظوم ہیں اور جو عام قصوں پر مبنی ہیں اور بہت سے فسانے ہیں جن کے ہیرو اور ہیروئنیں چنداں مشہور نہیں۔ ہندوستانی زبان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے اور ان میں اکثر مشہور ہیں۔ یہاں میں چند فسانوں کے تذکرے پر اکتفا کرتا ہوں مثلاً قصہ بلند اختر جو میر نے بیان کیا ہے قصہ رضواں شاہ جس کے میں نے دو ادیشن دیکھے ہیں قصہ چندر بدن اور مہیار جن کے متعدد ادیشن ہیں قصہ دلربا و دلارام جو موتی رام کی تالیف ہے قصہ ماہ سیہاب اور پری رخ جس پر وجہی نے ایک مثنوی لکھی ہے۔ فسانہ عجائب جو سرور کانپوری کی تصنیف ہے اور جسے چہار درویش کے برابر شہرت حاصل ہوئی ہے۔

میں ایسے قصے گنانے سے بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا میں نے ان میں سے اکثر فسانوں کا ترجمہ اور خلاصہ کیا ہے جن کے دیکھنے سے ان کے طرز بیان اور ترتیب کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر ان قصوں کی ابتدا ہیرو یا ہیروئن کی جسمانی یا اخلاقی تعریف سے ہوتی ہے اس کے بعد ان کی پیچیدہ اور عجیب و غریب سرگزشت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے دونوں کے وصال میں موانعات پیدا ہوتے ہیں آخر میں عاشق و معشوق کی ثابت قدمی اور وفا کا تذکرہ ہوتا ہے جس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ بعض

اوقات مگر بہت کم ان افسانوں کا اختتام فاکسی اور فراق دائمی پر ہوتا ہے۔
میر کی مثنوی ”دریائے عشق“ مجروح کی ”اعجاز عشق“ اور اخی کی ”مہر
و مات“ کا یہی حال ہے۔

ہندوستانی ادب و شاعری کی ایک اور شاخ ہے جس میں اُن مناظر فطرت
کی تصویر کھینچی جاتی ہے جن کا تعاقب سال کے موسموں اور مہینوں
کی خصوصیات سے ہوتا ہے۔ یہ نظمیں بارہ ماہے کہلاتی ہیں ان میں موسموں
کی حالت کے بیان کے سوا اور کچھ بھی نہیں پایا جاتا بعض اوقات ان کا انداز
بائبل نائک کا سا ہو جاتا ہے مثلاً یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر سال
بھر سے کسی دور دراز مقام پر ہے جس کے فراق میں یہ بیتاب ہے۔ اس ہجران
نصیب عورت کے شکووں کے ساتھ ساتھ نظم میں مناظر فطرت کی تبدیلیوں کا
بیان بھی ہوتا ہے اسی کے ساتھ خود کلامی کا دلغریب نمونہ بھی نظر آتا ہے پھر
یہ عورت کسی طائر کو اپنا قاصد بنا کر شوہر کے پاس بھیجتی ہے یہ طائر اکثر
وہ ہوتا ہے جس کے نغمے خاص طور پر مقبول خاص و عام ہیں (مثلاً کوئل۔
پھپھیا۔ بلبل۔ شامہ۔ ڈوا) (ملاحظہ ہو ایشیا تک جرنل سنہ ۱۸۵۰ ع جس میں میں نے
ہندوستانی مکالموں کی تشریح کی ہے)۔

اس مضمون کو متعدد شعرا نے بالتفصیل باندھا ہے اور ان میں مناظر
فطرت کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی تہواروں کے
تذکرے بھی آجاتے ہیں۔ اس قسم کی متعدد نظمیں ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر
میں نے اس سے پہلے کیا ہے۔

بعض نظمیں بالکل نرالی ہیں جیسے ”پھول چتر“ جس میں ہندوستان
کے پھولوں کا ذکر ہے۔ اسلامی ادب میں ایک خاص قسم کی تصنیف ہوتی ہے
جس میں متعدد افسانے مل جاتے ہیں یہ ہمارے ملک کے افسانوں سے بالکل
جدا ہے۔ یہ متعدد افسانے ایک سلسلہ میں مربوط ہوتے ہیں جن میں وحدت

مضمون کی رعایت ہوتی ہے ایسے افسانوں کا نتیجہ کبھی اخلاقی کبھی فلسفیانہ اور کبھی مذہبی ہوتا ہے۔ اس قسم کی چند مشہور تصانیف ”کشف الاسرار“ منطق الطیر اور اخوان الصفا ہیں۔ ایسی اور بھی تصنیفیں ہیں جو کافی طور پر مشہور ہو چکی ہیں۔ اخوان الصفا ہندوستان میں اکرام علی کے عہدہ ترجمہ کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی ہے اس میں یکے بعد دیگرے کئی جانور آتے ہیں اور اپنے کھالوں اور خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں اور انسان سے دعویٰ ہمسری کرتے پائے جاتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ جانوروں کے کردار میں خداوند عالم نے بہت سی ایسی باتیں رکھی ہیں جو ہمارے لئے قابل تقلید ہیں۔ اسی لئے انگریزی افسانہ نگار ”گے“ لکھتا ہے —

”شہد کی مکھی کی دائمی جد و جہد میری روح کو جگا دیتی ہے اور درس مشقت دیتی ہے۔ کون ہے جو دور اندیش چیونٹے کو دیکھکر مایہکجڑ کی فراہمی کا سبق نہ سیکھے گا۔ میرا کتا جو وفاداری میں تمام جانوروں سے ممتاز ہے مجھے میں وفا و عقیدت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ فاختہ سے مجھے مستقل مزاجی اور اہل خانہ سے سچی محبت کرنے کا سبق ملتا ہے اور آزاد پرواز والے پرندے مجھے پدرانہ فرائض کی تاقین کرتے ہیں۔“ —

اس قسم کی تصانیف میں قصے کا حاصل یعنی اخلاقی سبق ضرور ہوتا ہے۔ اس صنف کی سب سے مشہور کتاب ”پنچ تہترا“ ہے یعنی پانچ باب۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے جس کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں ہوا اس کتاب کے اکثر قصے یورپ کی مختلف زبانوں میں مختلف صورتوں میں آگئے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں کے مشہور مصنف لافونیٹن کی بدوات اس کا سب سے زیادہ مشہور افسانہ ہمارے ملک میں شہرت پا چکا ہے — اہل ہند کو فائدہ کا اب بھی ویسا ہی شوق ہے جیسا اُن کے اسلاف کو تھا لیکن اس کا اہتمام خاص خاص مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں

کلکتہ کے ایک مہموں مسلمان گھرانے میں یوسف زلیخا کا نائک ہوا تھا ایسے نائک کے کھیل اکثر مذہبی ہوتے ہیں اور عشرہ معمر میں ماتم حسین علیہ السلام کی سالانہ یادگار میں کئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ ہیں جن میں آنحضرت صلعم کی وفات یا شہادت امام حسن علیہ السلام اور خاصکر شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے * امام حسین کے سانحات اور ان کے مصائب ان تراموں کا خاص مضمون ہے۔ اب رہے ہندو سو وہ خوشی کے تہوار مثلاً ہولی کے موقع پر اس قسم کے نائک کرتے ہیں۔ ان نائکوں کو سوانک کہتے ہیں بعض اوقات یہ بعینہ اُسی طرح فی البدیہہ موزوں کئے جاتے ہیں جس طرح ہم لوگ خانگی جلسوں میں دل بہلانے کے لئے چھوٹے چھوٹے افسانے گھڑ لیتے ہیں مگر ان ہندو نائکوں کی زبان شستہ اور مہذب نہیں ہوتی۔ بایں ہمد ان میں بھی بعض وقت وہی مضامین ہوتے ہیں جو سنسکرت کے تراموں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ راگ ساگر ”ہنومان نائک“ کی مثال پیش کرتا ہے جو سنسکرت تراما سے لیا گیا ہے اور ولسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔

اس سے پہلے میں ذکر کرچکا ہوں کہ مشرق کے مسلمانوں میں ایک خاص شعبہ تصنیف ہے جسے تذکرہ کہتے ہیں۔ ایک دوسرا شعبہ انشا ہے جسے میں نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ انشا کے لغوی معنی ایقت کرنے کے ہیں۔ اس سے رقعات کی کتاب مراد ہے یا بالفاظ دیگر کسی مصنف کے قابل تقلید خطوں کا مجموعہ۔ انشا خط نویسی میں عبارت آرائی سکھاتی ہے۔ ہندوستان میں انشا کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔ انشائے فیض (فیض نے پند نامہ عطار کا ترجمہ بھی کیا ہے جو سنہ ۱۸۵۰ء میں بمقام کانپور طبع ہوا) انشائے خالق (کرامت اللہ)

* ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا شاید ایران میں معمر کے زمانے میں اس

قسم کے ترامے ہوتے ہیں۔ مترجم۔

انشائے نظام الدین ساکن پونہ یہ زمانۂ حال کے مصنف ہیں اور انہوں نے حکایات لقمان کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ چرونجی لعل کی انشا بھی اسی زمانہ کی ہے اور یہ آگرہ میں بہ عنوان انشائے اُردو طبع ہوئی ہے۔ انشائے یوسف دکن یہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دکن کے مصنف ہیں۔ میں سب سے آخر میں انشائے ہرکرن کا ذکر کرتا ہوں جس نے فارسی زبان میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کا ترجمہ بھی ہندوستانی زبان میں ہوا ہے۔

ہندوستانی زبان میں السنیات پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں جو ایشیائی زبانوں کے سیکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ہیں۔ میں صرف چند کے تذکرہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ مثلاً سنسکرت کی صرف و نحو کے متعلق ہندوستان میں ایک کتاب لکھی گئی ہے جس کا نام مفتاح اللغت ہے۔ سنسکرت کی صرف و نحو مولفہ نگہو کو مادی کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے جو بنارس میں سنہ ۱۸۳۵ ع میں طبع ہوا۔ صدرالافاضل فارسی زبان کی صرف و نحو ہے جو مظہر الدین نے لکھی۔ میزان فارسی یہ بھی اُردو میں ہے۔ مظہر النہو عربی زبان کی نحو ہے اور اُردو میں لکھی گئی ہے۔ اُردو زبان کی ایک لغت جس میں شعرا کے کلام کے اسناد ہیں۔ لغت السعید بھی اُردو زبان کی لغت ہے۔ ایک اور اُردو لغت جو سنہ ۱۸۵۱ ع میں آگرہ میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ اُردو صرف و نحو پر کئی کتابیں ہیں جن میں سے ایک صہبائی کی ہے انہوں نے عالم اللسان پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ”بہاشا پنگل“ جو بھاکا عروض پر ہے اس کے کئی ادیشن نکل چکے ہیں۔

آخر میں انگریزی صرف و نحو کی کتابوں کا ذکر کروں گا جو رام کرشن اور دیگر مصنفین نے ہندوستانی میں لکھی ہیں۔ تاریخ جس کا وجود سنسکرت میں صرف افسانوں کی صورت میں ہے ہندوستان کے موجودہ ادب میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ مگر اُس کی حیثیت معمولی ہے حالانکہ نظموں میں تاریخی واقعات کا تذکرہ کثرت سے کیا گیا ہے جن میں سے بیش قیمت معلومات

بہم پہنچتے ہیں جو دوسری جگہ کہیاب ہیں۔

میں نے ابھی تاریخی نظموں کے سلسلہ میں چند اور دوسروں کا نام لیا ہے۔ چند کو راجپوتانہ کا ہومر اور تھو سیتھ ائڈیس کہا جاسکتا ہے۔ تاریخی نظمیں بہت سی ہیں مثلاً لال کوی کی چرتہ پرکاش جو چتر شاہ راجہ بندھیلکھنڈ کی تاریخ ہے اور گوپاچک، تھایا تاریخ گوالیار۔ ایسی اور متعدد نظمیں ہیں مثلاً راجہ ویلاس جو رانہ راج سنگھ راجہ میواڑ اور مشیر اورنگ زیب کے شاعر مان کبیشہ نے لکھی۔ قاتہ صاحب نے اپنی تاریخ راجستان میں اس سے بہت مدد لی ہے۔ ہمیراس جو ہمیر راجہ چتور کی تاریخ ہے۔ ہری چندر لہلا (تاریخ راجہ ہری چندر) سورج پرکاش (تاریخ خاندان سورج بنسی) کرن کی تصنیف ہے جو عمدہ شاعر اور بہادر سپاہی تھا۔ یہ نظم در حقیقت ابھی سنگھ راجہ میواڑ کی تاریخ ہے جس نے سنہ ۱۷۲۴ ع سے سنہ ۱۷۲۵ ع تک حکومت کی مگر کتاب میں بطور مقدمہ کے راتھوروں کی عام تاریخ سے بحث کی گئی ہے جو سورج بنسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری نظم گرب چنتا منی یہ بہاشامیں ہے اور اس میں گجرات کے مشہور راجہ کرن کے حالات ہیں جس کو سلطان علاءالدین محمد شاہ سکندر ثانی نے دسویں صدی کے آخر میں شکست دی اور ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ایسی ہی ایک نظم راج پتن (تاریخ میواڑ) رنچھوڑ بہت کی لکھی ہوئی ہے۔ ایک اور نظم رشا بہاچرتہ (ایک مشہور سینڈی بزرگ کی تاریخ) ہے رنس کلی یعنی شجرہ خاندان بھوت کی تصنیف ہے۔ جے سنگھ نے ایک تاریخی رسالہ بھی لکھا ہے جو کالپادروما کے نام سے مشہور ہے ہندوستانی زبان میں جتنی تاریخی نظمیں ہیں سب کی سب ہندوستانیوں کی ہیں انہوں نے اسلامی مضامین پر بھی خاصہ فرسائی کی ہے۔

مثلاً ہری ناتھ کی لکھی ہوئی تاریخ محمد شاہ جس کا نام پوتھی

معہد شاہ ہے اس قسم کی جو کتاب اُردو میں ہے وہ یا تو ترجمہ ہے یا تالیف۔
البتہ چند رسالے ایسے ہیں جو خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اُن سے
الگ ہیں۔

ان کے علاوہ میں اب اُن دلچسپ تاریخی کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو
دہلی اور آگرہ پر لکھی گئیں۔ مثلاً آثار الصنادید اور تاریخ آگرہ وغیرہ۔ کلکتہ نامہ
بھی اسی طرز کی تصنیف ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ منظوم ہے۔ علی نامہ
علی عادل شاہ کی سوانح جات (واقعات گورکھا جو فیپال کا صوبہ ہے جہاں
کے راجہ نے اپنی سلطنت سارے فیپال میں پھیلا رکھی تھی۔ ایک نظم تباہی
سومناٹ پر ہے۔ ایک تاریخ نور معہد کی ہے جس میں بنگال کے قیام فرنگ کے
تذکرے ہیں۔ اسی طرح دھرم نرائن کی تاریخ سندھیا ہے۔ ان کے علاوہ
ہندوستانی زبان میں تیمور۔ بابر۔ اکبر۔ جہانگیر کے دلچسپ حالات ہیں جو یا
تو فارسی سے ترجمہ کئے گئے ہیں یا اُس کے اتباع میں لکھے گئے ہیں مثلاً پتمبر سنگھ
موہن لعل اور علی حزیں کے تذکرے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اہل مشرق میں تاریخ کا اتنا
لحاظ نہیں رکھا جتنا کہ ہم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حال کے ایک
ہندوستانی مورخ نے اپنی کتاب کی سرخی کے لئے حافظ کا یہ شعر منتخب کیا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کہتر جو

کہ کس نکشود و نہ کشاید بہ حکمت ابنِ معہد را

سفر ناموں کے سلسلے میں یوسف خاں اکھنوی کا سفر فرانس و انگلستان
(سنہ ۱۸۳۸ ع) کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو دہلی میں شائع ہوا۔ کریم خاں
دہلوی کا سفر نامہ لندن بھی قابلِ ذکر ہے۔ صاحب موصوت نے سنہ ۱۸۳۰ ع میں
لندن کا سفر کیا تھا۔ اس کا ترجمہ میں نے اورینٹل ریویو میں شائع کیا ہے۔
ان میں سے قبل الذکر صاحب پتھان قوم کے صوفی منش آدمی تھے۔ ان کا عرت

گہل پوش ہے کیوں کہ یہ ہمیشہ کھل اور بے رہتے تھے۔

مجھے ہندوستانی زبان کا تبصرہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی فلسفہ سے شروع کرنا چاہئے تھا کیوں کہ اس موضوع پر بہت سی دلچسپ کتابیں موجود ہیں۔ اہل ہندو کے فلسفہ مذہب پر کبیر پنتھیوں سکھوں اور جینیوں کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ اکثر کتابیں شیوائیوں کی ہیں مثلاً مہادیو ہرتر (تاریخ شیوجی) شیو لہلا مری تم (شیو جی کے لہلا کی خوشبو) گورا منگل (شیوجی اور پاربتی) کی شادی وغیرہ۔

مسلمانوں کے فلسفہ مذہب یعنی دینیات کے متعلق ہندوستانی زبان میں یا تو اسلامی مذہب یا عبادات پر کتابیں لکھی گئی ہیں یا ایسی کتابیں جن سے اُن کے اعتقادات کا سیاسی ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت محمد صلعم۔ حضرت فاطمہ و امام حسن و حسین کے تذکرے ہیں۔ نیز حضرت مسیح اور بی بی مریم کا ذکر بھی مسلمانوں نے اسی احترام و عقیدت سے کیا ہے حالانکہ وہ ہمارے مسئلہ تثلیث کے قائل نہیں۔

ہندوستان میں شیعوں کی تعداد کافی ہے۔ مگر دینیات پر ہندوستانی زبان میں زیادہ تصانیف سنیوں ہی کی ہیں۔ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو شیعوں کی وجہ سے وجود میں آئیں لیکن اسلامی دینیات میں سب سے زیادہ عجیب وہ کتابیں ہیں جو سید احمد کے فرقے (ہندی وہابیوں) اور روشنائی فرقے سے تعلق رکھتی ہیں یا جو ان کتابوں کی تردید میں لکھی گئیں۔

سیاست اور فقہ ہندوؤں میں بھی اسی طرح ملے جلے ہیں جس طرح مسلمانوں میں۔ دیوانی قانون تو بالکل شریعت میں داخل ہے۔ اس صنف کی چند عمدہ کتابیں ہندوستانی زبان میں ہیں مگر وہ سب ترجمے ہیں۔

سائنس اور فنون پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں۔ ایسی کتابیں زمانہ حال

کی پیداوار ہیں اور انگریزی تصانیف کے ترجمے یا تقلید پر مبنی ہیں مگر یہ ترجمے ان باشندوں کے لئے بہت مفید ہیں جن کے لئے یہ لکھے گئے ہیں۔ یہ ترجمے مختلف نوع کے ہیں جن سے ہندوستانیوں کو علوم کے مختلف شعبوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو زمانہ حال کی بالکل ناواقف تحقیقات سے بحث کرتے ہیں۔

ان کتابوں میں جو ایسے مضامین پر لکھی گئی ہیں جن کا ذکر فقرہ بالا میں کیا گیا ہے چند حقیقی تصنیف بھی ہیں بعض فن تعبیرات اور سنگ تراشی پر ہیں۔ بعض میں درختوں اور حزی بوٹیوں کے طبی خواص سے بحث کی گئی ہے جن سے مشرقی فن طب میں علاج کیا جاتا ہے۔ علاوہ دوسری بوٹیوں کے چوب چینی کے خواص کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چند کتابیں ایسی ہیں جن میں باز اور بحریوں کو شکار کے لئے تیار کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ یہ ان تصانیف سے بہت مشابہ ہیں جن سے دی ہیمر مرحوم نے ہم کو روشناس کرایا۔ کچھ کتابیں مویشیوں کے علاج۔ موتیوں کے اوزان اور قیمت۔ شطرنج کے کھیل۔ خواب کی تعبیروں اور فن طباطخی پر ہیں۔

ہندی ادب کی سب سے زیادہ اہم شاخ وہ ہے جس میں دیگر مشرقی زبانوں سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں سے سنسکرت۔ عربی۔ فارسی جیسی قدیم زبانوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ اس میں اصلی تصانیف کے اطف کو برقرار رکھا گیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترجمے بھی اُسی ماحول۔ مناظر اور رسم و رواج میں ہوتے ہیں جن میں اصل کتابیں لکھی گئی تھیں۔ میں پہلے ان کا تذکرہ کرچکا ہوں اور اعادہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ مجھے ہندوستانی زبان میں ویدوں کے کسی ترجمے کا علم نہیں مگر ابھی ابھی ایک ترجمہ کا اعلان کیا گیا ہے جو ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے ایک طویل سلسلہ کا پہلا حصہ ہوگا۔ کلام مجید (قرآن) کے بہت سے ترجمے ہیں جن میں تصحیح کا بہت لحاظ رکھا گیا

ہے۔ سید احمد نے اپنی کتاب آثار الصادید میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ ترجموں میں اکثر حاشیے اور تفسیر بھی دی گئی ہے۔ ایک ترجمہ دہلی میں شائع ہوا تھا جس میں زیادہ رواداری پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں سنیوں کے نقطہ نظر سے بھی مطالب بیان کئے گئے ہیں اور شیعوں کے اعتقادات کے مطابق شرح بھی کی گئی ہے۔ عشرت نامی ایک صاحب نے قرآن کی منظوم شرح لکھی ہے۔ میں اس سلسلے میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے لوگ ایرانیوں کے مثل اور ترکوں کے برخلاف اپنی مذہبی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کو معیوب نہیں خیال کرتے اور ہندوستانی عورتیں جمعہ کے دن اُسی طرح تلاوت قرآن کرتی ہیں جیسے کہ انگریزی عورتیں اتوار کے دن انجیل پڑھتی ہیں۔ ہندوستانی عورتیں عام طور پر ترکی عورتوں سے زیادہ تعظیم یافتہ ہوتی ہیں جو سب سے زیادہ اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ہیں۔

سنسکرت کتابوں کے ترجموں میں سے میں ”مہابھارت“ ”ہیتوپدیس“ ترک سنگرہا“ کو پیش کرتا ہوں۔ آخر الذکر کتاب ہندوستانی فاسفہ پر سنسکرت زبان میں اونم بھٹنر نے لکھی ہے یہ کتاب بنارس میں ۱۸۵۲ع میں شائع ہوئی اور یہ ایک ہندیات کے محقق ہیلنٹائن نامی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو میرے ایک دوست کپتان جے میچل کا بھتیجا (بھانجا) ہوتا ہے اس جلد میں اصل سنسکرت عبارت بھی ہے اور ہندی اور انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ تراسے بھی لکھے گئے ہیں یعنی وہ خاص تراسے جن کا ترجمہ ولسن نے سنہ ۱۸۴۵ع میں دہلی میں کیا۔ دوسرا تراسا ساہننا ستوٹرا ہے۔ جس کو سمر سنگھ نے سنسکرت سے ترجمہ کیا حالانکہ یہ تصنیف شیوائی ہے۔

سنہ ۱۸۴۵ع میں دہلی میں رگھو بنس کے ترجمہ کا انتظام ہو رہا تھا جو کالیداس کی تصنیف بتائی جاتی ہے اور جس میں رگھو خاندان کے حالات

ہیں۔ ادبیات کی راسخوں کا ترجمہ اور دوسرے تراجم بھی سنسکرت سے اُٹے جارہے تھے۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام پورا بھی ہوا یا نہیں۔ دوسرے تراجم کا ذکر میں نے اپنے افتتاحی خطبے میں کیا ہے۔

سنسکرت کے سلسلہ میں مجھے دوسری زبانوں مثلاً تلنگی۔ بنگالی۔ مرہٹی کے تراجم کا بھی ذکر کرنا چاہئے۔ مرہٹی زبان میں دوسری کتابوں کے علاوہ ایک مشہور کتاب ستیانروپن (صدانت) ہے۔ عربی ترجمہ کی خاص کتابیں کریم الدین کا ترجمہ تاریخ ابوالفدا سبحان بخش کا ترجمہ ابن خلکان۔ اخوان الصفا کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ حدیث میں ایک مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف ہے۔ فقہ میں ایک اور مشہور کتاب آداب القاضی ہے۔ جو شہرت میں قدوری کی برابر ہے جس کا خلاصہ اردو میں ہوا ہے۔

دہلی میں چند صاحبوں نے مقامات حریری کے ترجمہ کا ارادہ کیا مگر ان لوگوں کو انہیں وجوہ کی بنا پر اس کام سے دست بردار ہونا پڑا جن کے باعث میں اس کتاب کے فرانسیسی ترجمہ کرنے سے باز رہا۔ وجہ یہ ہے کہ ترجمہ میں ان نتائج کا برقرار رکھنا ناممکن ہے جو اس کتاب کی خاص خوبی خیال کی جاتی ہے۔

ادب عربی کی مشہور کتاب ”الف ایلم“ کا ترجمہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی کیا ہے۔ مسلمانوں میں میں حسن علی خان کشمیری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ایک ہم عصر مصنف ہیں اور جو دہلی کالج کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے بہت سے ترجمے کئے ہیں۔ دوسرے صاحب شمس الدین احمد ہیں جنہوں نے مدراس میں (۲۰۰ قصوں) کا ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمے کلکتہ والے ایڈیشن کا ہے جو لیتھو میں چھپا ہے اور Habicht اور Heicher کے ایڈیشن سے مختلف ہے۔ زمرہ ہنود میں دیا شنکر نسیم ہیں جن کے ترجمے اکھنڈ میں سنہ ۱۲۳۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۲۸ ع میں تین جلدوں میں شائع ہوئے۔ حال میں

۵۰ قصوں کے ترجمے دہلی میں شائع ہوئے ہیں نیز ایک انتخاب کتاب کی صورت میں چھپا ہے۔ علاوہ اس کے غنیم پسر تاجر کا ابھی ایک قصہ شائع ہو چکا ہے۔ انجمن اشاعت علوم مفیدہ نے جس کا مقصد یہ ہے کہ ملکی زبانوں کے ذریعے سے ہندوستان کے باشندوں میں مفید علوم کی اشاعت کرے ابوالفدا کے جغرافیہ کا ایک ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس انجمن نے رشید الدین کی تاریخ مغلیہ کی۔ ابن خلدون کی تاریخ بربری اور دوسری مشہور کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ ترجمے تکمیل کو نہیں پہنچے۔

فارسی زبان سے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ میں چند مشہور فارسی کتابوں کا نام بتا سکتا ہوں مثلاً گلستان جس کے متعدد ترجمے کئی کئی بار چھپے۔ بوستان سعدی جس کا ترجمہ مغل نے کیا۔ اس ترجمے نے بعض مبہم عبارتوں کے معانی کو صاف کر دیا ہے۔ مشہور رزمیہ نظم شاہنامہ جس کا ترجمہ منشی نے خسرواں عجم کے نام سے نظم میں کیا۔ محمد علی ترمذی اور سرور نے اس کے ترجمے سرور سلطانی کے عنوان سے نثر میں کئے ہیں۔ قصہ سہراب کا ترجمہ خاص طور پر قزلبی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ جلال الدین رومی کی مشہور کتاب مثنوی شریف کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کا مکمل ترجمہ نشاط نے کیا اور کریم الدین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی کے انتخاب کا ترجمہ شاہ مستان نے کیا جو کلکتہ میں سنہ ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا۔ یہ دونوں ترجمے نظم میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوست نے ہند نامہ عطار و ہند نامہ سعدی۔ منطق الطیر۔ حسن و عشق۔ اظہار دانش کے ترجمے کئے۔ شرافت نے بہار دانش اور محمد اعظم کی تاریخ کشمیر کے ترجمے کئے۔ تاریخ کشمیر کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں آخر میں میں تاریخ طبری کے ترجمہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو جعفر شاہ نے کیا۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابیں ہیں۔

چند ہندوستانی تصانیف کے ترجمے بھی دوسری مشرقی زبانوں میں

ہوئے ہیں مثلاً بہاری زبان کی کتاب ست سائی کا ترجمہ سنسکرت میں ”باغ و بہار“ کا ارمنی میں۔ راگ درشن اور دوسری اردو کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا جسے مشرق کی لاطینی زبان کہنا چاہئے۔ مثلاً قصہ دھرم سنگھ۔ افسانہ سورج پور جو اخلاقی افسانے ہیں۔ پہلی کتاب کا نام فارسی میں قصہ صادق اور دوسری کا شمس آباد ہے۔ ہندوستان میں مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی ترجمے ہوئے ہیں جس کو نئے حکمرانوں کا ادبی خراج سمجھنا چاہئے۔ فرانسیسی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً عیسائی (کیتھالک) پادریوں کی کوشش سے فلوری کی ”ہستارکل کیتیچزم“ اور ہمارے مشہور مشرقی ”دی ساسی“ کی عربی قواعد کا ترجمہ دہلی میں تیار کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح رالن کی مختصر تاریخ قدیم کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔ مگر ہندوستان میں فرانسیسی کتابوں کے ترجمے زیادہ تر انگریزی کی وساطت سے ہوئے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک کے ”ایلی دی بیوما“ جیسے لائق مصنفین کو خبر بھی نہیں کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ ہندوستانی کے ذریعہ سے آگرہ اور دہلی میں ہوتا ہے اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ سید احمد نے اپنی کتاب ”تفسیر انجیل“ میں عبرانی زبان سے انجیل کے ترجمے کا ارادہ کیا ہے۔

یہ ترجمے جو ہندوستانیوں کو ہمارے علوم و فنون اور قدیم و جدید تاریخ مثلاً تاریخ یونان و روما سے روشناس کرانے کے لئے کئے جاتے ہیں یقیناً بہت مفید ہیں ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ ترجموں میں رسیلاس۔ قزلباش۔ ویکار آت ویک فیلڈ۔ رابنسن کروسو۔ سفر نامہ بنیان۔ اکاناسی آت ہیومین لائف جیسی اعلیٰ ادبی تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان تصانیف میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طور پر عیسائی مذہب کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہ مذہب ایسا روح پرور درخت ہے کہ جس کی شاخیں

یہودا سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گئی ہیں۔ عیسائی کتب کے ترجموں میں چند ایسی ہیں جو نہایت سلیس انداز میں ہمارے اصولوں کی تشریح کرتی ہیں یا ہماری مقدس کتابوں کو مختلف شکلوں میں پیش کرتی ہیں۔ بعض مسلمانوں کی دلائل کی تردید میں ہیں کیوں کہ مسلمانوں کا تعصب عیسائیت کے خلاف بہت سخت ہے۔

مذہبی کتب کے ترجموں میں سب سے زیادہ دلچسپ امریکن پرسبائیرین پادریوں کا شایع کردہ ترجمہ قرآن ہے جو سنہ ۱۸۴۷ ع میں بمقام دہلی شایع ہوا۔ اس کے ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں پر بحث کی گئی ہے اور عیسائی مذہب کے مخالف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے متن قرآن کے معادی آیات قرآنی کی تفسیر بھی درج ہے۔

ہندوستان میں اس قسم کا کام اول اول پروٹسٹنٹ مشنری بنجمن شلز نے شروع کیا۔ اسی مشنری نے بمقام ہیملی سنہ ۱۷۸۷ ع میں اس قسم کی کتاب قرآن پاک کے متعلق شایع کی تھی۔ مذہبی ترجموں میں اینگلیکن لٹرجی کا ترجمہ اس واسطے کیا گیا کہ ہندوستانی اس کا مطالعہ کر سکیں۔ ایک دوسری غایت اس کی یہ بھی تھی کہ کلکتہ اور دوسرے شہروں کے گرجاؤں میں جو دیسی عیسائیوں کے لئے قائم کئے گئے ہیں اینگلیکن لٹرجی کے مطابق ہندوستانی زبان میں اسی طرح عبادت کی جائے جس طرح لندن اور بیت المقدس میں یہودیوں کی آسانی کی غرض سے عبرانی زبان میں ہوتی ہے۔ مذہبی گیتوں کے ترجمے بھی انگریزی بحروں کے مطابق ہندوستانی میں کئے گئے ہیں اور وہ گیت سینت پال اور وست منسٹر کے گرجاؤں کی طرح ہندوستانی میں بھی پائے جاتے ہیں بعینہ جیسے پیرس کے پروٹسٹنٹ فرقہ والوں نے فرانسیسی الفاظ جرسوں کے مطابق ترتیب دیکر قائم کئے ہیں۔

کچھ دنوں پہلے ہندوستان میں قلمی کتابیں استعمال ہوتی تھیں۔

کیوں کہ چھاپے کا رواج ہندوستان میں زیادہ نہ تھا اور مطبوعہ حروف کو بدنہا اور بے ہذا تصور کیا جاتا تھا اور اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ نستعلیق خط کا حسن جو خوش خط قلمی نسخوں میں نظر آتا ہے چھپنے میں زائل ہو جاتا تھا اور شکستہ خط تو چھپنے میں اور بھی خراب ہو جاتا تھا خوش قسمتی سے لیتھو نے ان تمام مشکلات کا ازالہ کر دیا ہے۔ طباعت کا یہ طریقہ ہندوستان میں خوب مقبول ہوا۔ لیتھو گرافی کا پہلا مطبع دہلی میں سنہ ۱۸۳۷ ع میں قائم ہوا اور سنہ ۱۸۵۲ ع تک صوبہ شمال و مغربی میں ایسے ۳۳ مطبع قائم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ایسے مطبع شمال ہند کے تقریباً ہر شہر میں اور ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں قائم ہو گئے۔ صرف لکھنؤ اور کان پور میں ۲۳ مطبع تھے جہاں سے چند سال کے عرصہ میں صدہا کتابیں چھاپی گئیں اور بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ آگرہ کے سرکاری گزٹ مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۵۵ ع کی صرف ایک فہرست میں نقشوں اور لیتھو کے نمونوں کے علاوہ دو سو کتابوں کے نام تھے۔ ان میں اکثر کتابیں تو ایسی ہیں جن میں ہندوستانیوں کے ائے ادب سائنس اور فنون کی ابتدائی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ہمارے ائے چنداں دلچسپ نہیں لیکن اسی کے ساتھ ان میں بہت سی کتابیں یورپ کے علما کے مطالعہ کے قابل بھی ہیں۔ مثلاً کریم الدین کے مرتب کئے ہوئے گلستان اور انوار سہیلی کے خلاصے۔ امین چند کا سفر نامہ جس میں پنجاب۔ کشمیر۔ سندھ۔ دکن کے چند مقامات۔ خاندیس۔ مالوا۔ اور راجپوتانہ کے دلچسپ حالات ہیں۔ چند و دیپکا۔ جس میں ہندی نثری پر بحث کی گئی ہے اور جو یورپ میں بالکل مفقود ہے۔

دہلی کی ایک انجمن نے ادبی اشاعت اور طباعت میں قابل تعریف کام کیا ہے یہ انجمن ورنکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی ہے جس کے سکریٹری ابتدا میں دہلی کالج کے پروفیسر اور ہمارے ہم وطن مسٹر بوٹرس تھے۔

اس انجمن نے سنسکرت-عربی-فارسی کے آسان اور اچھے ترجمے کر کے ہندوستانیوں کی ایک بڑی اور ضروری خدمت کی ان میں انگریزی کی چند بہترین کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔

طباعت کے سلسلہ میں میں ایک خاص قسم کے ادبیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اب تک مشرق میں مفقود تھا مگر اب ہندوستان میں نمایاں ترقی کر رہا ہے۔ میری مراد اخبارات و رسائل سے ہے جن کا اثر ہندوستانیوں پر کافی و وافی پڑا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ میں پچاس سے زائد ہندوستانی اخبارات سے واقف ہوں۔ چند سال پہلے کلکتہ میں ہندوستانیوں کے سولہ اخبار نکلتے تھے جن میں سے پانچ فارسی یا ہندوستانی ۹ بنگالی اور دو انگریزی زبان کے تھے۔ مولوی نصیر الدین کچھہ دونوں تک اپنا رسالہ ”مارتندا“ نکالتے رہے جو پانچ کالہوں میں پانچ زبانوں ہندی۔ ہندوستانی بنگالی۔ فارسی اور انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔ ابھی حال میں عورتوں کے لئے ایک رسالہ کی اشاعت کا اعلان ہوا ہے جو اردو میں شائع ہوگا۔ بہائی میں اس وقت تین چار اخبار عام ہندوستانیوں کے لئے اور دو خاص مسلمانوں کے لئے نکال رہے ہیں۔ ان کے علاوہ چار اخبار گجراتی میں پارسیوں کے اور دو مرہٹی میں ہندوؤں کے شائع ہو رہے ہیں۔ چند ہندوستانی رسالے مدراس سے نکلتے ہیں اور اس سے زائد تعداد میں آگرہ۔ دہلی۔ میرتھہ۔ لاہور۔ بنارس اور لکھنؤ سے۔ چند ہندوستانی رسالے سریرام پور۔ کدر پور۔ مرزا پور بھرت پور ملتان۔ بریلی اور اندور سے بھی نکلتے ہیں۔ اگر یہ تمام رسالے یورپ میں منگوائے جائیں تو یورپ کے اخباروں میں اشاعت کے لئے ان میں دلچسپ اور عہدہ مضامین مل سکتے ہیں۔

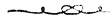


نظم ہاشمی

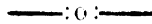
از

(جلاب مولوی سید ہاشمی صاحب - رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

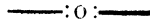
(حیدرآباد - دکن)



چیں ہوا کسے فصیب فرصت مستعار میں
نہیںد ہے ستر ماندگی دیدہ ہوشیار میں
عالم ریب و رنج میں موت کا اعتبار ہے
ہے یہ دھنک اُمید کی مطلع پر غبار میں



خندہ و دست و پا زنی کا کوئی مدعا نہیں
دیکھہ ظہور زندگی طفلک شیر خوار میں
فصل بہار کی ترنگ رنگ میں غرق ہو گئی
موج - جندون دشت کی چھپ گئی سبزہ زار میں



ناصیہ سیاہ پر نور سجود ہاشمی
بن گیا آہن آئینہ شوق لقاءے یار میں



طوطا کہانی اور سب درس

تحفہ کی جدید اشاعت (جلد اول نمبر ششم بابۃ ماء جہادی الثانی سنہ ۱۳۳۳ ہجری) میں ایک مضمون بعنوان ”طرز بیان“ شایع ہوا ہے۔ جس میں ایک موقع پر طوطا کہانی کا نام آگیا ہے۔ وہاں مدیر تحفہ نے ایک طویل فوٹ (صفحہ ۲۵۳ سے صفحہ ۲۵۸ تک) اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ اس فوٹ کو بظاہر اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض ایڈیٹر اُردو (مولانا عبدالحق بی۔ اے) کی بعض تحریرات پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ مدیر تحفہ کی دانست میں ایڈیٹر اُردو سے طوطا کہانی اور سب درس کے متعلق جو فرو گداشتیں ہوئی ہیں اس فوٹ میں اُن کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور بقول مدیر تحفہ کے یورپین حضرات کی تحقیقات صادقہ سے اخذ کر کے اُنہوں نے جو اصلاحات پیش کی ہیں ان کی حقیقت سطور ذیل سے منکشف ہوگی —

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

”طوطا کہانی کا ماخذ ایک سسکرت کتاب ہے۔ پہلے پہل فیہاء الدین نخشبی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کے دکنی اُردو ترجمہ کی نسبت مولوی عبدالحق صاحب گلشن ہند کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبدالعہ قطب شاہ کے زمانہ میں دکنی زبان میں لکھا..... مسٹر آغا حیدر حسن دہلوی پھول بن پر مفسون لکھ رہے ہیں اس میں آغا صاحب نے ثابت

کرد یا ہے کہ ابن نشاطی نے کوئی طوطی نامہ نہیں لکھا۔“

مدیر تحفہ اس بات کو نہیں مانتے ہیں کہ ابن نشاطی نے طوطی نامہ لکھا اور ان کے اس دعوے کی بنیاد آغا حیدر حسن دہلوی کے مضمون پر قائم ہے۔ چوں کہ آغا صاحب کا مضمون ابھی زیر اشاعت ہے اس لئے ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ ان کے یہاں اس دعوے کی تائید میں کیا دلائل ہیں۔ لیکن یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ابن نشاطی کے طوطی نامہ سے انکار کرنا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔ اس طوطی نامہ کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ میجر استوارٹ نے اس کتاب خانہ کی جو فہرست لکھی ہے اس کے صفحہ ۱۸۰ پر اس کا مفصل تذکرہ مرقوم ہے۔ پروفیسر تاسی نے پیرس میں اور ڈاکٹر ولسن نے مدراس میں اس کے با تصویر نسخے دیکھے ہیں۔ اس وقت اس کا ایک نسخہ قطب شاہی کتب خانہ کا ڈاکٹر سید محمد قاسم صاحب معالج سمیات کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ آگے چل کر طوطی نامہ کی نسبت مدیر تحفہ یہ ضافہ کرتے ہیں کہ—

”مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اُردو بابتہ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء صحنہ ۳۹۶ میں حیدری کی تصنیفات گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی ایک کتاب طوطا کہانی ہے جو فارسی طوطی نامی کا ترجمہ ہے۔ نخشی کے طوطی نامہ کا خلاصہ محمد قاسم نے کیا تھا اس کا یہ ترجمہ ہے۔“

ہمارے پیش نظر طوطا کہانی کا ایک نسخہ مطبع محمدی بسبئی کا سنہ ۱۸۹۳ء کا چھپا ہوا ہے۔ اس کی پیشانی پر تحریر ہے کہ طوطا کہانی ترجمہ کیا ہوا منشی بے بدل شاعر بے مثل جناب منشی حیدر بخش المتخلص بہ حیدری کا طوطی نامہ فارسی قادر بخش کے سے۔ قادر بخش نے طوطی نامہ فارسی میں نہیں لکھا بلکہ دکنی اُردو میں لکھا ہے اس کا ایک نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ہمارے نظر سے بھی طوطی نامہ کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ سنہ ۱۱۳۲ھ م سنہ ۱۷۳۱ء

گزرا ہے جس کو دکنی میں ملک محمد قادری نے لکھا ہے۔ جان گلکرسٹ نے حیدری سے جو طوطی نامہ کا ترجمہ لکھوایا ہے اس کے دیباچہ میں حیدری نے محمد قادری کا ذکر کیا ہے مگر دکنی میں نہیں لکھا۔ یہ ہے طوطا کہانی کی اصل۔“

سطور بالا سے مفصلہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ قادر بخش اور ملک محمد قادری دو مختلف مصنفین نے دو طوطی نامے لکھے۔

۲۔ قادر بخش کا طوطی نامہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

۳۔ مدیر تحفہ نے ملک محمد قادری کا طوطی نامہ دیکھا ہے۔

۴۔ قادر بخش اور محمد قادری کے طوطی نامے فارسی میں نہیں بلکہ دکنی میں لکھے گئے ہیں۔

۵۔ حیدری نے محمد قادری کے طوطی نامہ سے طوطا کہانی لکھی ہے۔

مدیر تحفہ سے طوطا کہانی کی حقیقت کے بیان کرنے میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد اغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ اولاً یہ کہ قادر بخش اور محمد قادری کو دو مختلف مصنف سمجھا ہے حالانکہ ایک ہی مصنف ہے اور اس کا صحیح نام محمد قادری ہے۔ ثانیاً یہ کہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے دکنی طوطی نامہ کو قادر بخش کی تصنیف بتایا ہے حالانکہ اس کے دیباچہ میں مصنف کا نام بصراحت محمد قادری تحریر ہے۔ ثالثاً یہ کہ محمد قادری نے طوطی نامہ دکنی میں نہیں لکھا بلکہ نخشبہ کے طوطی نامہ کو فارسی میں خلاصہ کیا ہے اور اس فارسی خلاصہ کا دکنی میں ترجمہ ہوا ہے۔

محمد قادری کا طوطی نامہ سترھویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوا ہے۔

(Rieu. B. M., P. Ms., P 752) اس میں ۳۵ حکایات ہیں اور مسٹر گلاتوین

نے اس کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ سنہ ۱۸۰۰ ع میں کلکتہ میں چھپوایا ہے۔

اس کے دیباچہ کی فارسی عبارت یہ ہے۔

” بعد از جنس جنس ثنا و صفت پیدا کفند آسمان و زمین کیفیت و حقیقت
 این است کہ داستان قصہ ہا و حکایات حضرت نخبی رحمة اللہ علیہ کہ در طوطی نامہ
 بعبادت سخت و دقیق نوشتہ بودند ان را برائے مفصل و بیان و از جہت معلوم شدن
 ہمہ مردمان متحصد قادری اصلح ائمہ شانہ از عبارت سلیس و آسان کہ مشتمل
 بر عبارت خطوط باشد و روزمرہ جواب و سوال کہ دولت مند ان را لائق باشد
 نوشتہ است “

عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں دکنی زبان کا جو طوطی نامہ ہے
 وہ اسی فارسی خلاصہ کا ترجمہ ہے اور ۱۵ ربیع الاول سنہ ۱۱۳۲ھ کو تھام
 ہوا ہے۔ اس میں بھی فارسی نسخہ کے موافق ۳۵ حکایات ہیں۔ اس کے دیباچہ کی
 عبارت یہ ہے —

” پیچہ سین طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کے کیفیت
 و حقیقت یہ ہے کہ داستان قصہ ہا و حکایات حضرت نخبی رحمة اللہ علیہ کو
 بھیج طوطی نامے کے سات عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں۔ اس کے تئیں مفصل
 و بیان وار واسطے معلوم ہونے تمام لوگ ان کو متحصد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ
 مرتبہ اونو کا بھیج عبارت سلیس و آسان کے کہ ملی ہوئی اوپر عبارت خطاں کے ہوئے
 و روزمرہ جواب و سوال کہ دولت مند ان کے تئیں لائق ہوئے لکھے ہیں “

محمد قادری کے طوطی نامہ کو سنہ ۱۸۰۰ ع میں گلاتوین نے کلکتہ میں
 شائع کیا۔ اس کے ایک سال بعد ڈاکٹر گلگرسٹ کی فرمائش سے سنہ ۱۸۰۱ ع میں
 بمقام کلکتہ حیدر بخش حیدری نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا اور طوطا کہانی
 اس کا نام رکھا چنانچہ طوطا کہانی کے دیباچہ میں تحریر ہے —

”سید حیدر بخش متخلص حیدری شاہ جہاں آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص
 نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم شاگرد غلام حسین خان ہازی پوری دست گرفتہ
 صاحب والا شان جان گلگرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ

تہوڑا بہت رابطہ موافق اپنے حوصلہ کے عبارت فارسی میں بھی دکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف نے سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اتھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ فیہ الدین بخشبی ہے زبان ہندی میں موافق مکاروہ اردوے معلیٰ کے عبارت سلیم و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔۔۔

بقول مدیر تحفہ کے طوطا کہانی کا جو نسخہ سنہ ۱۸۹۸ ع میں مطبع محمدی بمبئی میں چھپا ہے اس کے پیشانی پر لکھا ہے کہ حیدر بخش حیدری نے اس کو قادر بخش کے فارسی طوطی نامہ سے ترجمہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ طوطی نامہ کے مصنف کا نام لکھنے میں اہالیان مطبع سے غلطی ہو گئی ہے اور بجائے محمد قادری کے قادر بخش لکھ دیا ہے۔

—————:O:—————

مولانا عبدالحق صاحب نے سبرس پر جو مضمون لکھا ہے اس میں سنہ تصنیف کی نسبت لکھتے ہیں کہ میرے یہاں سبرس کے دو نسخے ہیں لیکن کسی میں بھی سنہ تصنیف مذکور نہیں ہے۔ اس کے بعد مولانا نے اس عہد کے حالات پر نظر کر کے از روے قیاس یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ ہجری کے بعد لکھی گئی ہے۔

مدیر تحفہ نے کتب خانہ آصفیہ کے ایک نسخہ میں کتاب کے اندر اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۴۵ ہجری دیکھا ہے۔ اس میں اور مولوی صاحب کے قیاس میں ایسا بین فرق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے سبرس کے عہد تصنیف پر کوئی تاریخی اثر پڑتا نظر آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کا استخراج اس لحاظ سے قابل تحسین ہے کہ انہوں نے کسی اندرونی شہادت سے فائدہ حاصل کئے بغیر محض واقعات کی بنا پر قیاس سے کام لے کر اس کا ایسا عہد تصنیف بیان کیا

جو خود مصنف کے بیان سے مغائر نہیں ہے۔ سنہ تصنیف کی بحث کے بعد مدیر تحفہ نے لکھا ہے کہ —

”رسالہ اُردو میں سب سے عبارت کا جو نمونہ دیا ہے ان نسخوں* سے مقابلہ کرنے پر جا بجا فرق نظر آتا ہے“

کسی کتاب کے دو قلمی نسخوں کو باہم مقابلہ کریں تو اُن میں ضرور فرق نظر آتا ہے۔ یہ کوئی نئی اور قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ یورپ میں عربی-فارسی کی جو کتابیں چھپتی ہیں اُن کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلمی نسخوں کے اختلافات لفظوں تک محدود نہیں رہے بلکہ بڑی بڑی کئی کئی سطروں کی عبارتیں بھی ان میں ایک دوسرے سے مغائر نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ عربی فارسی کی جب کسی کتاب کو چھاپتے ہیں تو اس کے آخر میں اختلافات نسخہ کی فہرست بھی شامل کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال شیخ فرید الدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء ہے جس کو پروفیسر نکلسن نے شایع کیا ہے اور اس کے آخر میں نصف کتاب کے قریب قریب اختلافات نسخہ کی فہرست شامل ہے۔ یہی حال لباب الالباب کا ہے جس کو پروفیسر براؤن نے شایع کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد ۳۳۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے اور اس کے آخر میں تین نسخوں کے اختلافات ۷۸ صفحوں پر بتائے گئے ہیں —

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

”مولانا نے سب سے کے ماخذ اور اس کے مصنف سے کوئی بحث نہیں کی ہے کتب خانہ آصفیہ کے مکمل نسخے کے خاتمہ پر لکھا ہے ”العبداللہ والسنة بحق حبیبہ کتاب سب سے تصنیف حضرت وجہ الدین گجراتی رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ شانزدهم روز سہ شنبہ شہر صدر المظفر سنہ ۱۲۹۵ ہجری باختتام رسید“.....

* ان نسخوں سے کتب خانہ آصفیہ کے دو نسخے اور آغا حیدر حسن کا ایک نسخہ مراد ہے —

مولانا سبرس کو تصوف کی کتاب نہیں سمجھتے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ کی فہرست جلد اول میں سبرس فن تصوف نمبر ۱۹۵ و ۲۳۲ پر رکھی گئی ہے اور مصنف کا نام وجہ الدین لکھا گیا ہے۔ —

مدیر تعفہ کو معلوم ہو کہ کتب خانہ آصفیہ کے مکمل نسخہ میں مصنف کا نام حضرت وجہ الدین گجراتی نہیں ہے بلکہ صرت حضرت وجہ الدین رحمة اللہ علیہ لکھا ہوا ہے البتہ کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں صفحہ ۵۱۲ پر سبرس کے مصنف کا نام صرت وجہ الدین نہیں بلکہ وجہ الدین گجراتی لکھا گیا ہے۔ —

مدیر تعفہ نے مشکوٰۃ النبیات سے اخذ کر کے حضرت شاہ وجہ الدین گجراتی کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ آپ احمد آباد میں سنہ ۹۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد غوث دوالیری کے خلیفہ تھے۔ سلخ محرم ۹۹۸ھ ہجری کو انتقال ہوا۔ آپ کی تصنیفات سے کئی کتابیں مشہور ہیں مثلاً رسالہ حقیقت معہدیہ و شرح جام جہاں نما وغیرہ۔ —

سبرس ۱۰۳۵ھ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے اور اس کے تصنیف ہونے سے سینتالیس سال پہلے ۹۹۸ھ ہجری میں حضرت وجہ الدین گجراتی نے انتقال فرمایا ہے۔ ایسی حالت میں سبرس کو حضرت وجہ الدین گجراتی کی تصنیف سمجھنا ایک صات و صریح غلطی ہے۔ مدیر تعفہ نے سبرس کے خاتمے اور فہرست کتب خانہ آصفیہ کے حوالہ سے مصنف سبرس کا نام وجہ الدین یا وجہ الدین گجراتی بیان کرنے کے بعد اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ —

”ان چیزوں پر غور و خوض کرنے سے سبرس کے ماخذ اور اس کے مصنف کے متعلق ممکن ہے کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔“ —

لیکن ہماری رائے میں ایک صات و صریح غلطی پر غور و خوض کرنے کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی اُمید کرنا ایک فعل عبث اور لاجواب

کوشش ہے —

مولانا نے اپنے مضمون میں سبرس کے مصنف کا نام وجہی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں گزرا ہے اور غواصی کا ہمعصر ہے۔ مدیر تحفہ نے اس کو نا کافی سمجھا اور اس میں جو خامی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کا ارادہ کیا۔ نہایت تعجب ہے کہ ان سے مولانا کی تحریر پر ایک حرف کا بھی اضافہ نہ ہو سکا اور جو دوسروں سے نقل کیا تو وہ بھی غلط اور بے سرو پا —

کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں سبرس کا فن تصوف میں رکھا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ کتاب حقیقت میں تصوف کی ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو غلطی سے فن غیر متعلق میں درج ہو گئی ہیں۔ عاقل خاں رازی کی پدماوت جس میں مصنف نے ہندوستان کے دو عاشق و معشوق مذہور و مد مالتی کا قصہ لکھا ہے (Ethe, I. O. P. Mss. 1634) کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں فن تصوف نمبر ۱۸۷/۲ پر درج ہے (ملاحظہ ہو فہرست جلد اول صفحہ ۳۰۶) ظاہر ہے کہ یہ ایک فسانہ ہے اور اس کو تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن غلطی سے یہاں درج ہو گیا ہے۔ یہی کیفیت سبرس کی ہے۔ اس میں اگرچیکہ مصنف نے اخلاق و تصوف کی متعدد باتیں ضمناً بیان کی ہیں لیکن مصنف نے ان باتوں کو مختلف عنوانات کے تحت میں نہیں لکھا ہے جیسا کہ بالعموم فنون کی کتابوں میں ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے سبرس کی بنیاد ایک فسانہ پر رکھی ہے اور اس اعتبار سے اس کتاب کو تصوف کی کتاب کے بجائے فسانہ کی کتاب سمجھنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

”مولانا سبرس کے ضمن میں غواصی کی مثلولی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ اور طوطی نامہ کا سنہ ۱۰۲۷ بتاتے ہیں۔ غواصی خود سیف الملوک

و بدیع الجمال کا سن تصلیف اس طرح لکھتے ہیں۔

بیس ایک ہزار اور ستاویس میں کیا ختم یو نظم دن تیس میں
مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غواصی نے اس
سے پہلے کوئی مثنوی طوطی نامہ وغیرہ نہیں لکھی۔

طوطی نامہ کا سنہ ۱۰۲۷ھ دراصل سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ہے
اور طوطی نامہ کا سن شاید ۱۰۳۵ھ ہجری ہو۔

مدیر تحفہ نے سطور بالا میں جس شعر کا حوالہ دیا ہے وہ سیف الملوک
و بدیع الجمال کے اس نسخہ سے منقول ہے جو سنہ ۱۲۹۰ھ میں چھپا ہے ملاحظہ
ہو نسخہ مذکور کا صفحہ ۱۱۳ سطر ۱۹ اور اس نسخہ میں کثرت سے غلطیاں ہیں
لیکن متعدد قلمی نسخوں میں جو ہماری نظر سے گزرے ہیں شعر مذکور اس
طرح تحریر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے
سنہ ۱۰۳۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

بیس ایک ہزار ہور پنج تیس میں

کیا ختم یو نظم دن تیس میں

اس میں شک نہیں کہ طوطی نامہ کا سنہ بیان کرنے میں ایڈیٹر اردو سے غلطی
ہوئی ہے لیکن مدیر تحفہ نے جس سن کی نسبت گمان کیا ہے وہ بھی غلط ہے۔
بلکہ غواصی نے طوطی نامہ میں بیان کیا ہے کہ یہ مثنوی سنہ ۱۰۳۹ھ میں
ختم ہوئی۔

بیس ایک ہزار ہور چالیس پہ نو

ہوئے تھے یو موتیان پوریان ہوں نو

سنہ کے متعلق ایڈیٹر اردو کی یہ غلطی محض اتفاقی ہے کیوں کہ یہ شعر ہم نے
خود انہیں کے نسخہ سے نقل کیا ہے۔

”سیرس علیہ رب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہونے والی ہے اس

لحاظ سے ہمدردی رائے ہے کہ ان فروگزاشتوں پر ایک نظر ڈال لیجائے اور انجمن ترقی اردو اگر اپنی مصلحت کے خلاف نہ سمجھے تو سب سے پہلے کو مستر آغا حیدر حسین دہلوی سے ادبیت کرا کے شایع کرے تو ممکن ہے کہ کوئی ایسی فروگزاشت نہ ہو سکے۔“

مدیر تحفہ نے سب سے پہلے کی ادبیت کے لئے مستر آغا حیدر حسن کو تجویز کیا ہے جو دہلی کے باشندے ہیں۔ اردوئے معلیٰ کی زبان ان کی مادری زبان ہے اور انہوں نے حیدر آباد آنے سے پہلے شاید ہی کسی وقت دکنی کا کوئی لفظ سنا ہوگا۔ بجائے ان کے اگر مدیر تحفہ کرنول، گوگی، شاہنور، یا بیجاپور کے کسی باشندے کا نام پیش کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ کیوں کہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان دکنی ہے اور یہ لوگ اس وقت تک ویسی ہی دکنی بولتے ہیں جیسی کہ غوامی، نصرتی، ابن نشاطی اور وجہی کی تصنیفات کی ہے اور ان تصنیفات کو صحیح طور پر پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کی ہم سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں۔

(س-م-ن)



مجالس العشاق

دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کے معارف میں کتب خانہ عبدالرحیم خان خاقان کے متعلق مولوی حافظ نظیر احمد صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے اُس میں کتاب مجالس العشاق کی نسبت لکھا ہے کہ یہ کتاب سلطان حسین مرزا بایقرا کی تصنیف ہے (معارف جلد ۱۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۱۹) سلطان حسین سنہ ۸۷۳ ہجری سے سنہ ۹۱۱ ہجری تک خراسان میں برسر حکومت رہا ہے۔ یورپ کے اکثر متشرقین مثلاً چارلس ریو۔ گستاو فلوگل وغیرہ نے بھی سلطان حسین ہی کو اس کتاب کا مصنف بتایا ہے اور خود کتاب مذکور کے دیباچہ میں بھی مصنف کا نام سلطان حسین تحریر ہے۔

”محرر این انشا خاک راۃ اولیا سلطان حسین ابن سلطان منصور ابن بایقرا (صحنہ بایسنقر) ابن عمر شیخ ابن تیہور گورگان“

لیکن حقیقت میں یہ کتاب سلطان حسین مرزا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے میر کمال الدین حسین گازرگی نے سلطان حسین کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ چنانچہ فردوس مکانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ (ولادت سنہ ۸۸۸ ہجری وفات سنہ ۹۳۷ ہجری) نے جو سلطان حسین کا معاصر ہے اپنی آٹوبیوگرافی میں ایک مقام پر اس کتاب کے مصنف کی نسبت بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب حقیقت میں امیر کمال الدین حسین گازرگی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ یہ بیان بابر کی اصل ترکی آٹوبیوگرافی جو بابر نامہ کے نام سے مشہور ہے صفحات

مندرجہ ذیل پر موجود ہے —

(۱) !لمنسکی IIminsky ایڈیشن - طبع قازان سنہ ۱۸۵۷ ع صفحہ ۲۲۱

(۲) بیورج Beveridge ایڈیشن - جو لیڈن کے مطبع بریل میں گب میموریل

Gibb Memorial کی طرٹ سے سنہ ۱۹۰۵ ع میں فوٹو انکوگرافی میں

چھپا ہے - ورق ۱۷۶ رخ اول —

ترکی زبان چونکہ ہمارے ملک میں بہت کم سمجھی جاتی ہے اس لئے ہم نے اس کے ترکی اقتباس کو قلم انداز کر دیا۔ لیکن بابر نامہ کے فارسی ترجمہ کی عبارت ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ اس ترجمہ کو عبدالرحیم خان خاقان نے سنہ ۹۹۸ ہجری میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے لکھا ہے اور عام طور پر واقعات بابری یا توڑک بابری کے نام سے مشہور ہے —

”دیگر کمال الدین حسین گازرگی بود۔ اگرچہ صوفی بنود۔ متصوت بود..... ایک تصنیفی دارد مجاس العشق نام۔ بنام سلطان حسین مرزا بستہ فوشته است۔ بسیار سست و اکثری دروغ و بے مزہ و بے ادبانه حرفها فوشته۔ از بعض سخنان بوی کفر می شنوند۔ چنانچه خیلے از انبیا و بسیارے از اولیا را بعشق مجازی منسوب ساخته از براے هر کدام معشوقی و محبوبی پیدا کردہ۔ این عجب کورافہ امری ست کہ در دیباچہ سلطان حسین مرزا تصنیف و تحریر من است فوشته“

یہ ایک سب سے بڑی اور زبردست شہادت ہے اس بات کی کہ یہ کتاب سلطان حسین کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے میر کمال الدین حسین گازرگی نے سلطان حسین کے نام سے لکھا ہے۔ امین احمد رازی نے بھی اپنی کتاب ہفت اقلیم میں (جو سنہ ۱۰۰۲ ہجری میں بمقام آگرہ تصنیف ہوئی ہے) اس کتاب کو میر کمال الدین حسین کی تصنیف بیان کیا ہے اور اقلیم سوم میں مشاہیر طبس کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے امیر کمال الدین حسین کے حالات میں لکھا ہے —

”شرح منازل السائرين و مجالس العشاق در سلک مولفات امیر کمال الدین

انتظام دارد“

امیر کمال الدین حسین کے حالات خواجہ غیاث الدین خوند میر نے اپنی مشہور تاریخ حبیب السیر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں اور یہی حالات لفظ بلفظ ملحقات روضۃ الصفا میں بھی مذکور ہیں۔ جس کا اقتباس کسی قدر اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(واضح ہو کہ میر خوند معتمد بن خاوند شاہ بلخی الہتوفی سنہ ۹۰۳ ہجری نے روضۃ الصفا کی صرت چھ جلدیں لکھی ہیں۔ ساتویں جلد جس میں سلطان حسین مرزا کے حالات ہیں حبیب السیر سے نقل کر کے بعد میں بطور ملحقات کے اس میں اضافہ کر دی گئی ہے)۔

امیر کمال الدین حسین ابیوردی در سلک فضائل سادات خراسان منتظم بود۔ و در عنفوان اوان جوانی ازابی ورد بہ ہرات آمد و بہ تحصیل علوم مشغول گشت۔ و در آن اثنا بہ مجلس شریف کیچک مرزا افتاد۔ و شاہ زادہ اورا مصاحب خود ساختہ ابواب احسان بر روی روز گارش بکشاد۔ اما در وقتیکہ مرزا کیچک عزیمت حج فرمود امیر حسین باوی موافقت نہ نمود و بعد از رفتن شاہ زادہ از توقف پشیمان شدہ از عقبش شتافت لیکن بحسب تقدیر ملک قدیر دران سفر بلکہ دیگر بخد متش نتوانست رسید۔ و چون حج اسلام گزاردہ مراجعت کرد و در تبریز بسعادت ملازمت سلطان یعقوب مرزا اختصاص یافت و چند سال دران مہلکت اوقات گزرانیدہ بوطی مالوت باز آمد و بخد مت امیر علی شیر پیوستہ ملحوظ عین التفات شد۔ در اواخر اوقات حیات خاقان منصور (مراد از سلطان حسین مرزا) ببلغ شتافتہ سلطان بدیع الزماں مرزا اورا بشعلکی آستانہ علیہ شاہیہ نصب کرد۔ و در سنہ ۹۰۸ ثمان و تسعمائے آن منصب را باسر صدارت مبدل ساخت و در سنہ ۹۱۰ ہشر

و تسعماً که بدیع الزمان مرزا در هرات بود امیر حسین از صدارت استعفا نمود و
 بابی ورد رفت و یک دو سال بفرافقت گزرانیده در سنه ۱۱۳ اربع
 عشر و تسعماً محمد خان شهبانی او را برسم رسالت متوجه درگاه عالم پناه
 نواب کامیاب شاهی (مراد از شاه اسمعیل صفوی) گردانید و امیر حسین
 بسعادت ملازمت آستان ملایک آشیان مشرف گشته مشهور انعام و احسان شده
 مراجعت نمود و در وطن مالوت و مسکن معهود یعنی ولایت ابی ورد رحل
 اقامت انداخت و در سنه ۱۲۰ عشرین و تسعماً عالم آخرت را منزل ساخت
 و از جبهه معیبات آنجناب این معنا باسم شاه زمان بر خاطر بود ثبت افتاد -
 شاه بازی که طرح عدل افکند نام خود در نگین دولت کند
 (حبیب السیر جلد سوم جزو سیم صفحه ۳۴۳ - روضه الصفا جلد هفتم طبع بهیئتی
 سنه ۱۲۷۱ صفحه ۷۹)

حکیم سید شمس‌الله قادری



تبصرے

مذہب

۳۴۹	ذکرِ
۳۵۰	بشرِ

متفرق

۳۵۱	خیابانِ عرفان
۳۵۲	مصراتِ جنگلات و تربیتِ جنگلات
	سالانہ رپورٹ دارالعلومات
۳۵۳	مودی کامتی
۳۵۴	روئداد جلسہ سالانہ منہج الطب لکھنؤ

اردو کے جدید رسالے

۳۵۴	شہ
۳۵۵	عبداللہ
۳۵۶	کوکب
۳۵۶	شاد بن
۳۵۷	اردو مطبوعہ
۳۵۸	کے زئی
۳۵۸	جام چہاں نہا



ادب

۲۸۳	مکتوباتِ حالی
۲۹۳	تبصرۃ الفہرست
۳۲۲	کوہرین نامہ
۳۲۳	مثنوی اسرارِ ہستی
۳۲۵	شرابِ عیش
۳۲۶	بہرام کی رہائی
۳۲۶	فطرتِ نسوانی

تاریخ و سیرت

۳۳۰	ترجمہ تزکی بابری اردو
	معروفہ بابرقامہ
۳۳۱	تاریخ بنی ہاشم
۳۳۲	سیرت مہر و ابنِ عامر
۳۳۶	کشمیر کی رانیاں
۳۳۶	سیرت علامہ عبدالعظیم سیالکوٹی

اخلاق و تعلیم

۳۳۷	درسِ حیات
۳۳۸	تربیت حصہ اول و دوم
۳۳۹	ساربان - امانت - نورِ ہدایت

ادب



مکتوبات حالی

(مرتبہ جناب خواجہ سجاد حسین صاحب بی اے)

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم اُن الوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کے حیرت انگیز جد و جہد - قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح دنیا سے تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم اُن سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت - خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ اُن کے پاس سے جو اُٹھا کچھہ لیکر اُٹیا اور اُن کے پاس جو گیا وہ کچھہ بن کر آیا۔ مولانا حالی اُن پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور اُن سے محبت بھی۔ اُن کے کلام نے اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج اُردو شاعری کا قدم ترقی کی طرف نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کی متین اور چچی تلی نثر اور تنقید نے اُردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے دل میں اُن کا ادب و احترام پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف اُن کی سیرت ہے۔ اُن کے پاکیزہ اخلاق اور اطوار۔ اُن کی داسوزی اور ہمدردی کا دلوں پر اثر پڑتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر اُن کی باتوں میں کچھہ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بخود اُن کے طبعات کے ساتھ تھے۔ وہ کہہ کہہ کر مذمت بادائے سے اہل

زبان آلودہ نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے روکتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے اُن پر سخت اور بیجا تنقیدیں کیں اُن کو بھی اُنہوں نے سراہا۔ اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اُس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے۔ ہمدردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھ کر خود تڑپنے لگتے تھے۔ باوجود ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر ہونے کے مزاج میں بے حد انکسار اور فروتنی تھی۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو دلوں میں گھر کر لیتی تھیں اور ان کی طرف سے محبت پیدا کرتی تھیں۔ اگرچہ خطوں کے اس مجھڑے میں جو اب چھپ کر شایع ہوا ہے زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روزمرہ کی معمولی باتیں آئے دن کے آلام و افکار۔ اپنی اور دوسروں کی بیماری اور مصیبت کا ذکر ہے مگر ان میں بھی ایک بات پائی جاتی ہے۔ علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہم عصروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں اُن کے دلی خیالات اور اُن محاسن کا پتہ لگتا ہے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

ان میں سے اکثر خط اُس وقت کے ہیں جب وہ سر سید مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ اس قابل قدر اور بے مثل کتاب کے لکھنے میں اُنہوں نے بے حد محنت اور جانفشانی اور کاوش سے کام کیا اور باوجود اپنی بیماری۔ خانگی پریشانیوں اور جھگڑوں اور ایک نواسے کے لاعلاج مرض کے جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی وہ برابر اسے لپٹتے رہے اور کئی سال تک خون جگر کھانے کے بعد اسے تمام کیا۔ جو کتاب اس قدر دماغ سوڑی۔ زحمت اور مسلسل کوشش اور جگرکاری کے بعد لکھی گئی تھی جب وہ شایع ہوئی اور اُن لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی۔ جن سے خاص طور پر یہ توقع تھی کہ وہ اس کی قدر کریں گے اور جو سر سید مرحوم کے فدائی۔ ساتھی اور ہمدرد تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس کا قلق ہوا۔ چنانچہ وہ ایک صاحب کو جو فواح علیگڑہ کے رئیس اور روشن خیال صاحب ذوق اور صاحب علم ہیں یہ لکھتے ہیں کہ ”تیرے مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ حیات جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی دیوتی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے منگوائی ہوں گی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہئے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی

بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر کھٹا دی ہے۔ جن لوگوں سے یہ اُمید تھی کہ اس کتاب کے منگوا نے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سر دھری کے سوا میں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس قلیل عرصہ میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے رہی شخص خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا اور کوئی مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سر سید کا کوئی دوست اس کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔ اور اخباروں کو جانے دیجئے عالمگدہ انسٹیٹیوٹ گزت جس کو سر سید کی یادگار کہا جاتا ہے اور جس کا اہتمام محققین کالج کے آفریری سکریٹری اور سر سید کے جانشین اور اُن کے زبدۂ احباب کے ہاتھ میں ہے آج تک حیات جاوید کی نسبت اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سر سید کی لائف جیسی کہ چاہئے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارگراں کو اپنے ذمہ لیکر سر سید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہے اور اس لئے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سر سید نے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے۔ مگر آج تک کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ اُن کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃ پیش کی جائے..... صاحب نے سر سید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پانسو روپیہ کی کتابیں خرید کر کالج کو دوں گا۔ مگر میں سر سید کو اور اپنے تئیں بڑا خوش قسمت سمجھوں گا جب یہ سنوں گا کہ اُنہوں نے کوئی کاپی دیوتی سے خرید فرمائی ہے اور اس کو مطالعہ کے لائق سمجھا ہے۔ آپ یقین جائفے کہ میں اس زمانہ کی لٹریچر ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو جو میری طرح محض اُردو فارسی کے مرد میدان ہیں لاشے معض جانتا ہوں۔ مگر مکرزی جو اپنا جالا پور نے میں منگھالے طاقت صرف کرتی ہے وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ ان سے بھی زیادہ گراں قدر تصور کرتی ہے۔“

یہ مولانا کے اکتھائی رنج اور صدمے کا اظہار ہے ورنہ وہ ایسے نیک مزاج اور شریف النفس تھے کہ تحریر میں تو کیا زبان پر بھی کسی کی شکایت نہیں آتی تھی اور یہ بھی اُنہوں نے ایک خانگی خط میں لکھا ہے اور وہ بھی ایک

ایسے صاحب کو جو اُن کے اور اچھی کتابوں کے قدر داں تھے اور جن سے ایک حد تک بے تکلفی بھی تھی اور پھر وہ ایک عام حالت کا نقشہ ہے جس کا بیان کرنا کچھ ایسا معیوب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس خط سے رنج اور صدمہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے اور ایک طرح کی شکایت بھی پائی جاتی ہے لیکن دیکھا جائے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کے لئے دل شکن ہو۔ اگر اُن کے بعض نامور ہم عصر مصنفین کی تعریروں یا خطوں سے مقابلہ کیا جائے جو اُنہوں نے ایسے موقعوں پر لکھی ہیں تو یہ تعریر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے صدمہ اور رنج کی انتہا یہ ہو وہ کیسا پاک سیرت ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سرسید کی دل سے قدر کرتے تھے اور سرسید کو مرے بھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ ابھی سے اُن لوگوں کا جو سید کی محبت اور جان نثاری کا دم بھرتے تھے یہ حال ہے تو انہیں بہت شاق گزرا۔ گھاؤ تازہ تھا۔ پھوٹ پڑے۔

اس خط میں ایک دوسری حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا ہے جو بہت ہی قابل افسوس ہے۔ ہمارے ہاں کے متمول اور صاحب ثروت لوگ کسی کتاب کی قدر کرنا تو کجا خرید کر پڑھنا بھی نہیں جانتے اور اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ مصنف اُن کی خدمت میں اس کا نسخہ ہدیۃ پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کی بہتر سے بہتر کتاب بھی اتنی نہیں بکتی جتنی دوسرے ممالک میں معمولی درجے کی کتابیں فروخت ہو جاتی ہیں۔ سرسید کے احباب کی اس بے اعتنائی کا اُن کے دل پر اس قدر اثر تھا کہ انہیں تاریخوں میں ایک خط میں جو اُنہوں نے اپنے ایک نیاز مند کے نام لکھا ہے اُس دکھڑے کو پھر رویا ہے۔ چونکہ یہ ایسی بیٹنا ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں اس لئے اس خط کے ایک حصے کے نقل کرنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

”میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھے سے اس بائیوگرافی کا حق ادا ہو نہیں سکا۔ لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کسی متنفس نے قلم یا درم سے براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی (الامشاء اللہ) پس اگرچہ یہ کام فی نفسہ کچھ قدر کے لائق نہ ہو مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف

کی ہے ضرور توجہ کے لائق ہے..... میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں نے مسدس مد و جزر اسلام کا پہلا اتیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سر سید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کی آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں۔ میں نے جواب لکھ بھیجا۔ اُنہوں نے اُسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیج دو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیج دیجئے۔ چنانچہ مہینے تیرہ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں سب فروخت ہو گئیں اور دوسرا اتیشن چھپوانے کی ضرورت ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اُن کے بڑے بڑے ذی مقدر دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ اُن کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔ بعضے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ تو کسی سے بھی اُمید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے۔

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نشد

چوں چراغان شب مہتاب بے جا سوختم

یہ خط بہت پر درد ہے۔ خط کیا ہے ہماری قوم کی ناقدر دانی کا مرقع ہے۔ اگرچہ اس خط کو لکھے پورے چوبیس برس ہوئے ہیں اور ملک کے حالات میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے لیکن عالمی قدر دانی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ ”جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم“

علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہیں کہاں ہمدردی تھی ان معاملات میں قلمبے۔ درمے۔ قدمے ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان کی تائید اور ہمدردی میں ایسی ایسی بے مثل اور بیش بہا نظمیں لکھی ہیں کہ اُن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ اُن کا ایک ایک شعر ہزاروں اور لاکھوں روپے کے چندے پر بھاری ہے۔ ان خطوں میں بھی کالج اور کانفرنس کا جا بجا ذکر آتا ہے اور جو کچھ اُن سے ہو سکتا ہے اس کے کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ خود شریک ہوتے ہیں۔ دوسروں کو شرکت پر آمادہ کرتے ہیں۔ چندے کرتے ہیں۔ راے دیتے ہیں۔ دوسروں کو راے دینے اور کام

کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کہ وجہ یہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد شغف تھا اور اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ بغیر تعلیم کے یہ قوم کبھی نہیں پنپنے کی۔ اپنے وطن پانی پت میں انہوں نے تعلیم کی بہت کچھ اشاعت کی۔ اپنے خاندان والوں کے سوا دوسروں کو بھی۔ تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور اُن کے لئے آسانیاں پیدا کیں اور ہر قسم کی مدد دی۔ پانی پت میں ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا۔

ان خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتہ چلتا ہے اور جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انہیں پرہ کر بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اُن میں کس قدر ہمدردی اور شفقت تھی۔ جب وہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھ اغزش ہو گئی ہے یا کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ہے تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اُس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی برا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ اُن کے کہنے کا اثر ہوتا تھا۔ مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو اُن کے فرزند کے متعلق لکھتے ہیں۔

”معلوم نہیں کہ انہوں نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہیں۔ اُن کو خدا تعالیٰ نے ایسی لیاقت دی ہے کہ ملک و قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور چونکہ عنایت الہی سے تلاش معاش کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک صرف کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی ناقدر دانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائگاں بھونا ہے اس موقع پر میں اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ عزیز موصوت بھی اس کو پڑھیں اور اگر وہ در حقیقت سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ہیں تو اس رباعی پر عمل کریں۔ رباعی یہ ہے۔

یارو نہیں وقت عیش و آرام کام یہ
موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ
بس جب وطن کا جب چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ“

مولانا کا ایک نواسہ ہے جو ایک لا علاج مرض میں مبتلا تھا اور جوں جوں اس کے دورے بڑھتے جاتے تھے اس کا مزاج نازک ہوتا جاتا تھا۔ مولانا اس کی اس طرح ناز برداری کرتے تھے کہ ماں باپ بھی نہیں کرسکتے۔ دنیا بھر کا کوئی

علاج ایسا نہ تھا جو انہوں نے نہ کیا ہو تا کڑوں اور حکیموں کا تو کیا ذکر ہے اُن میں سے تو شاید ہی کوئی چھوٹا ہو اگر کسی اتائی کو بھی سن پاتے ہیں کہ وہ اس بیماری کا علاج کوتاہی سے تو وہاں پہنچتے ہیں اگر کسی عامل کو سن پایا تو اس کے پاس دوڑے پھرتے ہیں۔ کسی دوست نے کوئی نسخہ بتا دیا تو اُس پر عمل کرنے پر آمادہ ہیں۔ غرض اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی تلخ تھی۔ وہ ایک بار اپنے چچا کے ہاں جاتا ہے۔ اُس وقت مولانا نے اُسے خط لکھا ہے جس میں اُنہوں نے ددھیال اور فٹھیال والوں کے برتاؤ کا فرق بتایا ہے اور پھر کس کس طرح یہ سمجھایا ہے کہ اُسے وہاں کس طرح رہنا چاہئے۔ اس میں ایسی کام کی۔ تجربہ کی۔ دور اندیشی کی باتیں لکھی ہیں کہ پڑھنے کے قابل ہیں اور ایسی صاف ستھری اور سادہ زبان میں لکھی ہیں کہ ایک بچہ بھی پڑہ سکے اور سمجھ لے اور اثر قبول کرے۔ افسوس کہ یہ خط کسی قدر طویل ہے اور ہم اُسے نقل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں لیکن انہیں چیزوں سے ایک اشیا پر داڑ کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے ایک نیازمند کو لکھتے ہیں ”اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑہ کر بہت لطف آیا۔ نہایت پر زور مضمون لکھا ہے۔..... آپ ہی کا حصہ تھا۔ مگر برتیش۔ فارن پالیسی پر اس میں جابجا نوک جھوک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف مصلحت ہے۔..... میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں۔ اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو لہذا آپ اس سلسلہ کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے“ نصیحت کی تلخی کو کس طرح تعریف کی شیرینی سے گوارا کر دیا ہے۔

ایک دوست کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تعزیت کا خط لکھا ہے۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں ”اگرچہ یہ موقع نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہے مگر میں اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ خدا کے تھام کام حکمت اور مصلحت سے بھرے ہوتے ہیں۔ بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے حق میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس سے کچھ کام لینا چاہئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سید احمد خاں صاحب نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم کی نظر میں حاصل کی اس کا کیا سبب ہے؟ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ اُن کی اہلیہ اُن کی جوانی میں مر گئی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے اُن کو دوسری شادی کی صلاح دی مگر اُنہوں نے ایک

نہ مانی اور اپنے بچوں کو اپنے کنار شفقت میں لیا اور اُن کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور اپنی دماغی طاقتوں سے جو بسبب تجربہ کے اور زیادہ سرسبز اور شگفتہ ہو گئی تھیں وہ کام لئے جنہوں نے آج اُن کو تھام ہندوستان بلکہ تھام دنیا میں مشہور اور نامور کر دیا۔ اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہرگز یہ رتبہ ان کو حاصل نہ ہوتا۔ آپ کے لئے یہ نہایت عمدہ موقع ہے کہ آپ ہمہ تن اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جائیے اور نوکری بھی چاہے کرو چاہے نہ کرو اور اگر زیادہ ہمت ہو تو خود بھی تحصیل علم کرو اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ پھر نہ اولاد کی تم کچھ خبر لے سکو گے اور نہ اپنی زندگی کا کچھ مزا اُٹھاؤ گے بلکہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور اولاد بے علم رہ جائے گی اور اُن کو آپ سے کچھ محبت اور اُلفت نہ رہے گی۔ اگر ان کو اپنا قوت بازو بنانا چاہتے ہو اور اپنی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتے اور اولاد کو علم و ہنر سکھانا چاہتے ہو تو کمال صبر و سکون اور عفت اور پاکدامنی کے ساتھ تجربہ اور آزادی میں بسر کرو۔ —

جب کوئی اُن کی تعریف و ستائش کرتا تو اس کا جواب یا شکریہ تو لکھتے مگر بڑی خوبی سے قال جاتے تھے اور بعض اوقات اپنے متعلق بھی رائے دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں آپ کے ریہارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کئے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔ —

می گریم و از گریہ چو ظالم خبرے نیست

در دل ہو سے ہست و ندانم کہ کدام است“

اسی شخص نے جب حیات جاوید پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں ”حیات جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضاے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں اُن کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہ ہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر

بیچنا کہتے ہیں۔“

ایک عزیز کو اکسٹرا اسٹنٹنی کا عہدہ ملا تو اُنہوں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ یہ اُنہیں کی سعی اور محنت کی بدولت ہے۔ مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں ”جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہے۔ اگر بغرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں کچھ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آج کل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں۔ غیروں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ اپنی بساط سے زیادہ اُن کی امداد کرتے ہیں۔ تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوششیں کرتے ہیں جیسی کہ خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے۔ اپنی جان اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ قوم کی طرف سے اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم کو دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہئے اور انہی کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہمدردی کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔“

مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔ چنانچہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً وہ نواب محسن الملک مرحوم کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں ”ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے“ یا وہ اپنے ایک نیاز مند کو لکھتے ہیں کہ ”آپ کا آرٹکل جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار میں نکلا ہے۔ میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبعیت نہایت خوش ہوئی..... کی حقیقت پر جو بردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ترستیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ جب کسی بد صورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو وہ بھی اُن کے قہقہوں میں شریک ہو جائے۔ چونکہ میں بھی فنگ ترستیان ہوں اس لئے میں بھی ترستیوں کی فدا مت میں اُن کے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔“

چونکہ مولانا ایک مشہور اور نامور شخص تھے اس لئے اکثر عزیز اور

احباب انہیں سفارشوں کے لئے تنگ کرتے رہتے تھے۔ ایک ایسی ہی فرمائش پر وہ لکھتے ہیں ”شاید تم اور اور لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ مجھے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔ اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارت ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں۔ پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش کروں گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اے عزیز یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دنیا دار المعاضہ اور دار الکفالت ہے۔ جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلہ کی توقع پر کرتا ہے۔ میں تمہاری ایک سفارش اس لئے منظور کرتا ہوں کہ مجھے تم سے دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے۔ پس ایک ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کا عوض متوقع نہ ہو کیونکر کارگر ہو سکتی ہے۔ جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امرا اُس کی خاطر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی اُسے ہر جگہ مل جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارشیں کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلاً التفات نہیں کرتا۔ یہی میرا حال ہے۔“

مولانا نے ایک ال نامہ بھی لکھا تھا جو اُن کی زندگی میں شایع نہیں ہوا کیونکہ اُس میں ہر فرقے اور گروہ پر چوت ہے۔ چند جملے انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں مثلاً الہدھب۔ اعلان جنگ۔ الدین۔ تقلید آبا و اجداد۔ العلم۔ قسہے از جہل مرکب۔ الامتحان۔ آزمائش لیاقت مہتحنان۔ الیونیورسٹی۔ کارخانہ کلرک سازی۔ العلی گدہ پارٹی۔ شہید وفا۔ العلی گدہ کالج۔ پرورش گاہ طفلان بدست مائندراں۔ الکھیشن۔ وجہً موجه برائے فیصلہ یک طرفہ۔“

ان خطوں میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی ملتے ہیں مگر بہت کم۔ یہ زیادہ تر کاتب یا پوچھنے والے پر منحصر ہے۔ کسی نے اگر کوئی بات پوچھی ہے تو اس کا جواب معقول دیدیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ مجموعہ کامل نہیں ہے۔ بہت سے ایسے خط ہوں گے جو تلف ہو گئے ہیں یا قابل مرتب کے ہاتھ نہ ہیں لگے۔

ان خطوں سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ جواہرات حالی میں جو حال میں شیخ محمد اسماعیل صاحب نے پائی پت سے شایع کی ہے۔ بعض نظمیں چھوٹے بچوں کے لئے مولانا کے نام سے درج ہیں۔ ان میں سے اکثر نظمیں مولانا کی لکھی ہوئی نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے خلف الرشید

خواجہ سجاد حسین صاحب سے ان کے افسیکٹر تعلیمات نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کی فرمائش کی۔ انہوں نے ہامی بھری اور مولانا کو لکھا۔ مولانا کو طوعاً کرہاً قبول کرنا پڑا۔ لیکن اس زمانے میں مولانا علیل تھے اور علالت نے طول کھینچا تو انہوں نے یہ نظمیں مولوی محمد سعید صاحب مرحوم مدرس اول عربی و فارسی بورۃ ہائی اسکول دہلی سے لکھوادیں اور کہیں کہیں مناسب اصلاح کر دی۔

آخر زندگی میں مولانا خانگی جھگڑوں اور فکروں سے بہت عاجز آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کہیں فراغت اور اطمینان سے بیٹھ کر کچھ علمی کام کریں لیکن افسوس کہ یہ فراغت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ بلکہ اسی پہ حیرت ہے کہ ان تمام حالات میں انہوں نے اتنا بڑا کام کیونکر کر لیا۔ اردو ادب کے متعلق دو ایک کام اُن کی پیش نظر تھے جن کا مسودہ انہوں نے خوب غور کر کے اپنے دل میں قائم کر لیا تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں انہیں پورا کر دیں۔ لیکن اس کا موقع نہ ملا اور وہ سارے مسودے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ آخر آخر میں اُن کا ارادہ تھا (جیسا کہ اُن خطوں سے معلوم ہوگا) کہ اورنگ آباد میں رہ کر کچھ کام کریں لیکن علالت نے مہلت نہ دی اور اسی علالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تاہم وہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ کر گئے ہیں کہ وہ کسی ملک اور کسی قوم میں ہوتے اُن کی ہستی قابل فخر سمجھی جاتی۔ اُن کی زندگی علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایسی پاک صاف۔ خالص اور بے ریا ہے کہ ہمیشہ اہل وطن کی رہنمائی کرے گی اور اردو زبان پر تو اُن کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اہل زبان اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار راہیں اور اُن گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی اداسی نہیں۔ نظم ہو فاول ہو تہرما ہو یا کوئی اور مضمون ہو غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے۔ اور صنعت گری کی عمر بہت تیز ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایک ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں۔ بشرطیکہ اس میں صداقت ہو۔ اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ہمارے خبیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ جھوٹا بوی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔ اور یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سی دلکش

نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اُتھا کے الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف۔ ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے۔ غیروں کے لئے ہے۔ اور یہ سبجہ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گے۔ اس لئے مصلحت وقت کا بھی خیال ہوتا ہے۔ عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح طرح کے پیرواے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوی کا پردہ بھی اُتھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ اور ہر شے کے متعلق جیسا اُس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ نہ دوسروں سے چوکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے۔ اس وقت نہ اُسے خوں لائٹا ہوتا ہے اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ اُن خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اُس کے دل میں ہوتا ہے اُسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کے رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو۔ جس میں ہمدردی فنی نوع انسان کو کٹ کٹ کے بھری ہو۔ جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو۔ تو بتاؤ کہ اُس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔ *

تبصرة الفہرست

دنیاے صحافت اور عالم اشاعت میں ارباب قلم کی صدھا قسہیں اور اہل انشا کی سیکڑوں قومیں آباد ہیں یہاں ان سب کے شمار و اعداد سے بحث نہیں بلکہ اس جم غفیر میں صرف دو اصناف کا تذکرہ مقصود ہے۔ ایک وہ جو اپنی ذاتی ناموری و شہرت کی بدولت اشاعت کتب میں کامیابی حاصل کرتے

* کعب دو جلدوں میں چھپی ہے جو تقریباً پورے آٹھ سو صفحے پر ہے۔ فاضل مرتب سے پانی پت سے پانچمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے چار روپیہ کلدار میں مل سکتی ہے۔

ہیں دوسرے وہ جن کو حسن اتفاق سے کتاب کے لئے ایسا سوزوں و دلچسپ نام مل جاتا ہے جس کی عام دل پسندی تصنیف کے پہلے ایڈیشن کو ایک حد تک تاجران کتب اور اہل ذوق سے روشناس کر دیتی ہے۔ پہلی قسم کے اکثر مصنفین کو دو چار تصنیفوں کے بعد کچھ ایسا مرض استغنا لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر اُن کے موجودہ کارناموں کو دس برس پہلے کی تصنیفات سے ملایا جائے تو ان دونوں نمونوں میں باہم کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی وہ کاوش تحقیق اور سعی قلم جو نام آوری کی اُمید میں ابتداء نظر آتی ہے شہرت یابی کے بعد سہل انکاری سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِلا ماشاء اللہ۔ اب رہے صنف ثانی کے حضرات اُن کے متعلق یہ سوء ظنی تو بھر حال بے محل ہے کہ وہ طالب شہرت نہیں : ع : جبل گردہ جبلی بر نہ گردہ۔ خوشامد پسندی اور شہرت طلبی انسان کی طبیعت ثانی بن گئی ہے اور چوں کہ اب اسی رنگ کو قبول عام حاصل ہے اس لئے کسی کو کسی سے جھپینے کی ضرورت نہیں ”من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو“ مگر یہ واضح رہے کہ ایسی خود ساختہ طبیعت ثانی فطرت ازلی کو دبا نہیں سکتی اگر ان کی ہر خود غلط خواہشات کو کامیابی حاصل نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں سوزونیت نام اور دل چسپی مضمون کی گندم نہائی سے ایک مرتبہ نقد سودا تو ہو جاتا ہے مگر تاجران کتب کی جو فروشی سے خریداروں کی نگاہ میں پھر کوئی ساکھ قائم نہیں رہتی —

اس تہید کے بعد جس کتاب کے متعلق چند خیالات کا اظہار منظور ہے وہ مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کا مجموعہ ہے یعنی مصنف بھی غیر معروف نہیں اور مضمون و نام بھی بخصوصیت عام دل کشی کا ناز پرور ہے بایں ہمہ بعسرت کہنا پڑتا ہے کہ مرض استغنا کے ساتھ عارضہ بے حسی بھی اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے —

پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی نے حسب بیان خود انجمن ترقی اُردو کی تجویز کے مطابق الفہرست کو مرتب کرنا شروع کیا ہے اور مسلسل بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد (۸۱۵) صفحات کی کتاب شائقین کے دست طلب تک پہنچائی ہے۔ کتاب مذکور جیسا کہ اُس کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے مطبوعات اُردو کی فہرست ہے۔ ادبی اہل مذاق میں شاید ہی کوئی کو دن ایسا ہوگا جس نے الفہرست کا نام سن کر بے تابی کے ساتھ اس کے مطالعے کی خواہش پیدا نہ کی ہو۔ ایسی مقبول افام کتاب کو کیسا ہونا چاہئے؟ اس توضیح سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کے دیباچے کا اقتباس لکھا جائے جس سے یہ اندازہ

ہو سکے گا کہ اس کی ترتیب و تالیف میں کیا کیا وعدے کئے گئے ہیں اور اُن کا ثبوت کس کس طرح بہم پہنچایا ہے —

اقتباس دیباچہ

”سنہ ۱۹۱۳ء میں جب انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی تو ایک تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست اُن تمام کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پائے کی موجود ہیں تاکہ آئندہ اُن سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں اور اُردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے..... ملک میں ہر فن کے صاحب کمال موجود ہیں۔ میں نے چاہا کہ اُن کی مدد سے اس کام کو پورا کروں چنانچہ بعض صاحبوں سے التجا کی کہ اپنے اپنے فن کی کتابوں کی فہرست مرتب کر دیں..... مگر مجھے یہ ظاہر کرتے افسوس آتا ہے کہ پوری ایک نے بھی نہ دی اور تو اور مصنفین سے ان کی تصانیف کی فہرست پوچھی تو اکثر اصحاب نے راقم کے نیازناموں کا جواب بھی نہ دیا مجھے اکیلے سے جو کچھ ہو سکتا تھا کئے جاتا تھا آج پورے تیس برس اس دھن میں کت گئے والی مسکلت دکن کی سرپرستی نے میری ہمت کے بازوؤں میں نئی طاقت پیدا کر دی اور میں ہمت تن علمی مشاغل میں مصروف رہا اور جیسی مجھے سے ہو سکی فہرست مرتب کر دی..... مجھے کو اعتراف ہے کہ فہرست ناقص ہے اور بہت سی باتیں اس میں اصلاح کے قابل ہیں اُردو ایک زندہ زبان ہے اور وہ بھی نو عمر۔ اس میں روز بروز نئی کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اس سبب سے یہ کوشش کہ تمام کتابوں کے نام اس میں آجائیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتی فہرست کا نام مکمل اور ناقص دھنا لازم ہے۔ ممکن ہے کہ اثنائے طبع میں ایسی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہوں جن کے نام اس میں نہ ہوں..... جب خطوط سے کام نہ چلا تو میں نے ارادہ کیا کہ خود ہی سفر کروں اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جا کر کتابوں کے متعلق معلومات حاصل کروں اس غرض کے لئے میں نے سرکار سے تین ماہ کی رخصت مانگی سرکار نے کتاب کی تیاری کے لئے روپیہ بے دریغ

دیا لیکن وقت دینے میں تامل فرمایا ناچار مجھے بھی جو کچھ جمع ہو گیا تھا اُسی پر قناعت کرنی پڑی“ (اُسی سلسلہ عبارت کے ساتھ وقت نہ دینے کے ثبوت میں معتمد صاحب تعلیمات کا مراسلہ نشان ۱۹۴۳/۱۹۴۵ نقل کیا گیا ہے جس سے مولف کی دقت نظر اور اعتقاد صداقت پر آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے)

یہ اقتباس دیباچہ کے ۲ صفحوں سے کیا گیا ہے۔ اور کتاب کے نفس ترتیب کی بحث انہیں سطروں میں ختم کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد آخر دیباچے تک اُردو زبان کی ابتدائی و تمہیدی تاریخ اور بعض مصنفین کی کتابوں کا ذکر اور انہیں ترقی اُردو کی مطبوعات کا تبصرہ ہے۔ غرض کہ اس التقاط سے مولف کی مجبوریوں اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں تک ذہ پہنچنے کا حال معلوم ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اُن کے انہماک و شغف اور مالی پے فکریوں کا اندازہ بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ جبر و اختیار کے سمجھنے کے بعد اگرچہ اہل ذوق کی توقعات بہت محدود رہ جاتی ہیں پھر بھی (۸۱۵) صفحات کا حجم کافی اسید افزائی کا ضامن ہو سکتا تھا۔ یعنی اس عبارت میں اُتر فہرست کے ناقص رہنے کے اعتراض پر بیان ختم ہو جاتا تو یقیناً ماننا پڑتا کہ صاف گو مرتب نے ایک ناقص کتاب کو بھجوری یا بضورت شائع کر دیا ہے مگر اس کے بعد کا سلسلہ عبارت ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ جملے نہ صرف رسمی تکلف ادبی کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں بلکہ حقیقتاً وہ اس تفصیل کا اجمال ہیں کہ دوران طبع میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ اس فہرست میں درج نہیں ورنہ اس سے پہلے کی اکثر مطبوعات مندرج کر دی گئی ہیں۔

۸۱۵ صفحوں کی کتاب کے ساتھ مقدمے کا جتنا تعلق ہو سکتا ہے وہ ۲۴ صفحوں سے ایک سطر بھی زیادہ نہیں اُس کے بعد تاریخ اُردو کے اٹنے ۳ صفحہ دیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس تاریخی تحقیقات میں یہاں کسی عام تنقید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تاہم بطور فائدہ ایک غلط فہمی کا رفع داد نا مناسب نہ ہو گا۔ دیباچہ کے صفحہ ۶ پر عبارت ذیل پڑھی جائے:-

مخاطب کو اپنا مفہوم سمجھانے کے لئے مسلمانوں نے بہاشا اور ہندوؤں نے فارسی الفاظ بولنے شروع کئے۔ ہوتے ہوئے اس اختلاط نے ایک تیسری زبان ایسی پیدا کر دی جس کو نہ فارسی ہی کہہ سکتے ہیں نہ بہاشا۔ بلکہ ہندو مسلمانوں کی ضرورت پورا کرنے کی ایک مخلوط زبان تھی۔ شاہجہاں کے زمانے میں جب دہلی

دار الخلافہ قرار پائی تو ہر ملک کے لوگ جو مختلف پیشے (اس کے بعد کا لفظ پڑھا نہیں جاتا شاید ”زبانیں“ ہو جس کو زیادت کاتب نے لکھ دیا ہے) دیکھتے تھے دہلی میں آکر جمع ہوئے اور یہ زبان باہسی تفہیم مطالب کا آلہ بن گئی۔ اور اُردو کہلائی۔“

آب حیات اور اُس کے بعد اُس کی تائید و تقلید میں جتنی کتابیں مرتب ہوئی ہیں اُن سب نے یہ غلط خیال پھیلادیا ہے کہ اُردو کا نام (بہ حیثیت زبان) شاہجہان کے عہد سے شروع ہوا ہے۔ حالانکہ اُس وقت عموماً اُردو کا مفہوم لشکر یا لشکر گاہ کے سوا کچھ اور نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تغلقی عہد کے امیر خسرو ہوں یا علی عادل شاہی نصرتی و ہاشمی حتی کہ معتمد شاہی زمانے کے وای۔ حاتم۔ آبرو۔ آرزو وغیرہم سب کے سب بغیر کسی شبہے اور استثناء کے اس ممزوج زبان کو ریختہ کہتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اب سے پون صدی قبل مرزا غالب بھی کہتے ہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہر رشک فارسی گفتہ غالب ایک بار پڑے کے اُسے سنا کہ یوں

بظاہر اس غلط اشاعت و یقین کا سبب اُردوے شاہجہانی کا لقب ہے جو محض اُس لشکر کی بازار کو دیا گیا تھا جو صاحب قراں کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ اگر دیکھنی اور دہلوی تاریخی منقولات ادب غلط مان لی جائیں تو ایسی نفی کا اثبات محال ہے ورنہ کون ہے جس کو ”خالق باری“ اور ”علی نامہ“ جیسی مولفات دیکھنے کے بعد یہ وہم بھی ہو سکتا ہو کہ اُردو شاہجہان کے عہد میں پیدا یا شروع ہوئی اور بفرض محال اگر لفظ اُردو کا استعمال عصر کہیں میں کسی زبان کے لئے ثابت بھی ہو جائے تو سعدی دکنی اور امیر خسرو وغیرہم کے اشعار دیکھتے ہوئے اُردوے شاہجہانی کی جگہ اُردوے تغلقی یا عادل شاہی کہنا حق بجانب ہوگا اور اس طرح ساف صالحین کی محنت کا شکر یہ اعتراف نہا سعادت اخلاص کا ثبوت مانا جائے گا۔

اسی سلسلہ تحقیقات تاریخی میں میر شیر علی افسوس کی کتاب باغ اُردو کا زمانہ تالیف بھی غلط بتایا گیا ہے۔ باغ اُردو تاریخی نام ہے جس سے سنہ ۱۲۱۲ ہجری برآمد ہوتے ہیں اور اُس کی مطابقت سنہ ۱۸۰۰ ع سے ہوتی ہے یہ سنہ آغاز تالیف کا ہے اور انجام کی تاریخ ”آغاز اُردوی“ ہے جس سے سنہ ۱۲۲۲ ہجری حاصل ہوتے ہیں مگر مرتب الفہرست نے سنہ ۱۷۷۲ ع چھپوائے ہیں جو شاید اُن کی ولادت کا زمانہ ہو سکتا ہو۔

اتنی دیباچہ نویسی کے بعد صفحہ (۸) کے آخر سے صفحہ (۱۷) تک مطبوعات انجمن ترقی اردو کی جو فہرست و تشریح کی گئی ہے اُس کی تصحیح و تغلیط کا بار انجمن مذکور کے روضہ نشین سکریٹری صاحب کو اپنے سر مبارک پر لینا چاہئے۔ کیوں کہ راقم عاجز کو ابھی جتنے بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑنا ہے اُن کے مقابل میں مطبوعات انجمن کا شمار صفر (۰) کا مترادف ہے۔

دیباچے سے گزر کر سب سے پہلے جو ورق سامنے آتا ہے اُس پر مضامین مندرج کی فہرست بر محل چہرہ کشا ہوتی ہے۔ غالباً مرزا صاحب نے طوالت و صرفۃ کاغذ کے تر سے مضامین کے خانہ شمار کو ”چون مد بحساب اندر“ سمجھ کر تبصرہ نویس کو عقد انامل کا عادی بنانا چاہا ہے۔ چنانچہ اس چھوٹی ہوئی عادت کو از سر نو یاد کرنے کی زحمت گوارا کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ترتیب مضامین کا شمار (۹۲) تک پہنچتا ہے۔ اگر ہر مضمون سے پہلے شمار کا نمبر بھی ہوتا تو یقیناً اس شکوۂ واجبی کی گنجائش نہ رہتی۔ بہر حال اس نو و چہار یعنی ہم جوار ۹۹ نو و نہ کے پھیر سے نکل کر ترجمہ قرآن مجید کی تلاوت کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرسری نگاہ سے یہ بھی نظر آتا ہے کہ دقیقہ رس مرتب نے مختلف مذاہب کی کتابوں کو جدا جدا دکھایا ہے۔ مثلاً: فقہ (غالباً اہل سنت) فقہ اہل تشیع۔ دینیات۔ اہل سنت و جماعت۔ دینیات اہل تشیع۔ مذہب نصاریٰ۔ مذہب ہنود۔ اس احتیاط و تشریح کا اقتضا تھا کہ ترجمہ قرآن شریف میں بھی اہل سنت و تشیع کی تفریق کردی جاتی۔ خدا جانے کوئی نا معلوم مصلحت تھی یا غفلت مجہول کہ اس قیاس مع الفارق کو متعدد سمجھا گیا۔

قرآن شریف کے بعد تفسیر کا نمبر ہے اور اسی سے متصل تجوید کا حالانکہ اصول تفسیر اور اصول فقہ یہ دونوں مشہور و مستقل فن مانے جاتے ہیں ان کا عدم اندراج بھی تعجب خیز ہے۔ اسی سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت اسہاء الرجال کا عنوان نہ پا کر ہوتی ہے۔ تذکرۃ الشہدا کے عنوان کے بعد تذکرۃ الاولیا کا عنوان بھی ضروری تھا مگر شاید اس پہلو تھی میں فلسفۂ عملی کے ماہر کی کوئی حکمت عملی پوشیدہ ہوگی۔ فہرست مضامین کی اسی قدر تنقید اور تشریح کافی ہے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسی کتاب کو کیسی فہرست کے ساتھ مرتب ہونا چاہئے تھا اب آئیے اصل کتاب کو کھول کر دیکھا جائے کہ اس عنوانی ترتیب میں کسی خاص مصروفیت و تنگی

وقت کی وجہ سے تساہل و تسامح بعید از قیاس نہیں۔

رسالہ اُردو اپنے طویل الذیل حجم کی بدولت جوع المضامین کا ضرور عادی ہے مگر ترتیباً ہون کہ نقد و نظر کی لطافت و لذت اس داستانِ دراز کو اتنا نہ بڑھا دے کہ موجودہ اشاعت میں دوسرے مضامین کی جگہ نہ رہے اس لئے حتیٰ المقدور کوشش کی جائے گی کہ مختصر مگر مدلل تبصرے پر مضمون کو ختم کر دیا جائے۔ فہرست مضامین کے ۹۴ عزرائف کے نمبروں کی تفصیل غیر ضروری ہے اور وہ اس لئے کہ تہام عنوان کے تحت میں ایک ربع خانہ پری بھی مکمل نہیں ایسی حالت میں ایک ایک نمبر کے لئے ایک دوسری (۸۱۶) صفحوں کی کتاب لکھنا کم از کم اس وقت میرے امکان سے باہر ہے۔ قصہ کوتاہ اور اندکار سے پہلے اُس نقشے کی نقل کی جاتی ہے جس کے تحت میں تہام کتابوں کی فہرست ہے:۔

نمبر	نام کتاب	نام مصنف	سنہ اشاعت	تعداد صفحات	قیمت	نام مطبع	ملنے کا پتا	کیفیت
------	----------	----------	-----------	-------------	------	----------	-------------	-------

بادی النظر میں یہ خانہ کئی معلومات بڑھانے کے لئے کافی و موزوں ہے مگر جس کاوش و خیال سے یہ عنوانی نقشہ قائم کیا گیا ہے اُسی توجہ سے خانہ پری بھی کی جاتی تو یہ فہرست اپنی نزاعیت میں بے مثل کتاب ہوتی دو ایک عنوان اس نقشے میں زائد بھی ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا کیوں کہ اُن کے ہونے سے مستقبل کوئی مستقل فائدہ نہیں۔ مثلاً (قیمت کتب اور ملنے کا پتا) یہ عنوان اس لئے مدفول ہیں کہ ایک نہیں سیکڑوں کتابیں ایسی ہیں جن کے انطباع کا موقع صرف ایک بار ہاتھ آیا ہے اور اُس طباعت کو بھی اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ کسی مطبع یا کتب فروش کے پاس اُس کا ہونا یقینی نہیں۔ ان عنوانوں کے عیوض میں اگر دو عنوان اور قائم کئے جاتے تو یہ فہرست نہ صرف کتابوں کے نام اور پتہ بتاتی بلکہ مختصر تاریخ ثابت ہوتی۔ یہ عزرائف مختصر آ حالات مصنف اور مجملہ مضمون تصنیف کی تنقید کے متعلق ہونے چاہئے تھے۔ اس زمانے میں فہرست کتب شائع کرنے کی اصلی غایت اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ناظرین فہرست اصل کتابوں کے مطالعے سے ایک حد تک مستغنی ہو جائیں اور جس قدر ضروری باتیں ایک تصنیف میں ہوتی ہیں اُن سب کا مختصر نمونہ فہرست میں نظر آجائے۔ ظاہر ہے کہ تعداد صفحات کے شمار سے بہتر یہ مفید باتیں تھیں کہ کتاب کا مالہ و ماعلیہ اور مصنف کے خاص

خاص مفید و مشہور واقعات مثل توطان و سنین ولادت و وفات وغیرہ معلوم ہوتے رہتے۔ اگرچہ دریائے معلومات کے مقابل میں یہ ایک چھنیٹا ہوتا پھر بھی اس اوس سے تشنہ کامان تاریخ کی پیاس تھوڑی بہت ضرور بجھ جاتی۔

اس عنوانی تبصرے کو ختم کر کے تکمیل خانہ پری پر جب نظر پڑتی ہے تو مدون فہرست کی شان سادگی (عدم خانہ پری) نئی بہار دکھاتی ہے۔ تراجم قرآن شریف میں ۲۰ ترجمے درج کئے گئے ہیں مگر ان میں خانہ کشی کے حساب سے بصنعت تصنیف فرو گزاشتیں موجود ہیں۔ جن کی تشریح حسب ذیل ہے:—
(۱) خانۂ کیفیت میں ۲۰ کیفیتوں کی جگہ صرف ۲ کیفیتیں مندرج ہیں اور وہ بھی مجہول۔

(۲) ملنے کے پتوں میں صرف (۷) پتوں کا نشان ہے۔ ۱۳ ندارد۔
(۳) مطبعوں میں بھی نصف نام چھپے ہوئے ہیں اور حیرت ہے کہ مرزا حیرت۔ مولوی نذیر احمد اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کی جاے طباعت تک مفقود ہے۔

(۴) قیمت کا شمار بھی نصفاً نصف ہے۔
(۵) صفحات میں صرف (۶) مجلدات کے شمار کی غالباً خیالی یا تخمینی تکلیف گوارہ کی گئی ہے۔

(۶) سنہ اشاعت میں حکومت تئلیٹ کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔
(۷) مترجمین (مصنفین) کے ناموں میں بھی پانچ نام کسی خصوصیت سے دو چار معلوم ہوتے ہیں۔

(۸) اب رہے کتابوں (قرآن) کے نام جن کو ترجمہ قرآن کے سوا کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس فہرست میں تراجم قرآن کے نام یہ ہیں:—

(الف) اعجاز القرآن۔ معجزات قرآنی کی بحث میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ لفظاً لفظاً تو کیا جستہ جستہ بھی ترجمے کا پتہ نہیں۔

(ب) اعجاز البیان فی لغات القرآن۔

(ج) مفتاح القرآن۔

(د) لغات القرآن۔

(هـ) دلیل الحیران۔

(و) کلید خزائن قرآن۔

- (ز) جواہر قرانی —
 (ح) معجزات القرآن —
 (ط) جواہر الصدیہ فی احکام القرآن —
 (ی) اقتباس الانوار من کلام الغفار —
 (ک) فہرست المصنفین من کلام رب العالمین —

جیسا کہ ان کتابوں کے ناموں سے ظاہر ہے وہی مبحث یعنی خاص مضامین قرانی یا فہرست و الفاظ فرقانی نظر آتے ہیں۔ ان کو مستقلاً ترجمے میں شامل کرنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا۔ اگر اس قسم کے امتزاج کی اطلاع مقدمے میں لکھ دی جاتی تو اصولی فروگزاشت کے سوا اشتراکی غلطی کی گرفت کا موقع نہ ملتا۔ ایک نئی اور مفید معلومات اس نمبر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ فتح الحمید نامی ایک ترجمہ قران نواب محمد حسین قلی خاں نے اور ایک ترجمہ قران مولوی نصیر الدین نے بھی کیا ہے۔ اول الذکر کے خانہ کیفیت میں یہ الفاظ درج ہیں (لفظی ترجمہ برائے اہل تشیع)۔ موخر الذکر بجز لفظ آگرہ (نام مطبع) اور ہر ایک خانہ پری سے معرا ہے۔ شایقین ترجمہ عموماً اور برادران شیعہ خصوصاً نواب محمد حسین قلی خاں کے لفظی ترجمے کے جس قدر مشتاق ہو سکتے ہیں۔ اُس کا اندازہ مجھ سے زیادہ بعض ناظرین کو ہوگا۔ افسوس ہے کہ اس مفید تحقیقات کو ایسی بے پروائی سے ختم کیا گیا ہے کہ بجائے شکر مدون کا شکوہ زبانوں پر جاری ہے۔ علاوہ تراجم اہل سنت مولوی مقبول احمد اور مولوی فرمان علی کے شیعہ ترجمے آج کل اس قدر دائر و سائر ہیں کہ دہلی اور قریب قریب اکثر بڑے بڑے شہروں کے کتب فروش بھی اُن سے نابلد نہیں مگر مدون الفہرست لا عام ہیں۔ العجب!! یہ ایک عنوان فہرست کی مجہلاً تفصیل کی گئی ہے اگر اسی حیثیت سے تمام عنوان کی شرح کی جائے تو صفحات اُردو کیا اوراق زمین و آسمان سے آبیں ان یچھلنھا کی صدا بلند ہونے لگے۔ جس کتاب کی باے بسم اللہ میں یہ حالت ہو اُس کی تالے تھت تک پہنچنا اگر ”کوہ کندن و کاہ برآوردن نہیں“ تو ”صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا“ ضرور ہے۔ اس لئے ہر عنوان کی خانہ پری کو اس تفصیل سے بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ من شاع التفصیل فلیرجع الی الفہرست (مگر مفت) —

اگرچہ ناظرین سے زیادہ راقم الحروف اس تبصرے کی طوالت سے گھبرا رہا ہے مگر چون کہ ہر عنوان کے تحت میں مختلف صلتوں کے ساتھ ترتیب کی

نیرنگیاں نظر آتی ہیں اس لئے دیدہ و دانستہ تبصرہ نویسی کے معمولی فراٹس بھی ادا نہ کرنا شایقین الفہرست کو دھوکا دینا ہے۔ تہام عنوانوں سے جملہ قسم کی غلطیوں کا احصا و شمار آسان نہیں لہذا صرف اقسام اغلاط کی تعداد کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے گا یہ کہ (۸۱۵) صفحات کے مجموعہ اغلاط کو گنوا یا جائے۔ ان چند نمونوں کی سیرہی سے اہل مذاق سیر ہو جائیں گے اور سمجھ سکیں گے کہ کس قدر دیدہ ریزی اس مدون نے مفید کام کی تدوین میں فرمائی ہے۔

اقسام اغلاط

(۱) مختلف فنون کی کتابوں کا تصادم یعنی تراجم سے لغات اور تاریخ سے ناول کو بہرا دیا ہے۔

(۲) ایک مضمون کی تصنیف کو دو کیفیتوں میں منقسم کر دیا ہے۔

(۳) معمولی اور متداثر کتابوں کی حقیقت و حالت غلط لکھی ہے یا عنوان کے خانوں کو خالی چھوڑ دیا ہے۔

(۴) ایک کتاب کو ایک ہی عنوان میں مکرر دکھایا ہے۔

(۵) بعض مشہور ترین تالیفات حال کو درج نہیں کیا ہے۔

(۶) اُردو کتابوں کی فہرست میں فارسی و عربی کی کتابیں بغیر اطلاع ترجمہ اصل مصنفین عرب و عجم کے ناموں کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔

(۷) عموماً عنوانات لکھنے کے لئے ایک صفحہ مخصوص کیا گیا ہے۔ مثلاً تراجم قرآن۔ تفسیر و غیرہ۔ لیکن متعدد عنوانات ایسے بھی ہیں جن کو یہ تمغے امتیاز عطا نہیں ہوا۔

(۸) ایک طرح کی کتابوں کے خواہ مخواہ دو عنوان قائم کئے گئے ہیں

مثلاً سیرت نبی۔ مولود شریف و سوانح صہری رسول اکرم۔

(۹) خانہ شمار کے ہندسے بعض عنوانوں میں غلط ہیں۔

(۱۰) مصنفوں کے نام غلط لکھے ہیں (دیکھئے صفحہ ۸۸)

اب اس اجمال کے تفصیلی نمونے ملاحظہ ہوں:-

(۱)

(الف) تراجم قرآن کے ساتھ جو لغات قرآن و غیرہ کی غیر متعلق کتابیں

شامل کی گئی ہیں ان کے نمونے اس سے پہلے لکھ دئے ہیں مکرر

تکلیف نظر فضول ہے۔

(ب) موضوع القرآن۔ مصنفہ شاہ عبدالقادر دہلوی۔ یہ نام شاہ صاحب کے

ترجمہ قرآن کا ہے جیسا مولوی فذیر احمد نے اپنے ترجمہ قرآن میں خبر دی ہے —

(ج) عنوان تفسیر کے اکیسویں نمبر میں مقدمہ تفسیر القرآن مصنفہ مرزا حیرت دہلوی بہ تعداد صفحات (۷۱۸) بغیر اظہار قیمت درج ہے اور اس کے بعد نمبر ۲۲ میں تفسیر القرآن اسی پر حیرت مصنف کے نام سے بہ تعداد صفحات (۷۲۰) بہ قیمت چھ روپیہ سنہ ۱۲۲۲ کی مطبوعہ موجود ہے۔ اس اندراج کے متعلق کئی باتیں تنقیح طلب ہیں۔ اول یہ کہ سنہ ۱۲۲۲ ہجری میں یا عیسوی میں۔ اگر ہجری میں تو مرزا حیرت کی زندگی قابل رشک ہے اور اگر عیسوی میں تو غالباً اب حضرت عیسیٰ کی دوبارہ تکلیف فرمائی تحصیل حاصل ہے : ع : عیسیٰ کی ہیں اس نے آنکھیں دیکھیں۔ بھر حال اس لطیفہ سخن میں یقیناً ایک شوشے کا فرق کاتب کے سر تھوپا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۳ کو ۱۲ لکھ گیا ہو گا۔ مگر اس تعجب کا کیا علاج کیا جائے کہ جس تفسیر کا حجم ۷۲۰ ہو اُس کے مقدمے کی ضخامت صرف دو صفحے کم ۷۱۸ دکھائی گئی ہے۔ اکثر مدعیان وقوت اب تک مولوی عبدالحق صاحب کو الفضل للمتقدم کا دعویدار و مستحق سمجھے ہوئے تھے مگر ایسی مقدمہ بازی کے سامنے : ع : غلط است اُنچہ مدعی گوید —

(د) تفسیر القرآن مصنفہ سرسید احمد خاں مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (۱۳۱۵) قیمتی چالیس روپیہ ضرور قابل دید تفسیر ہو گی (یعنی مطبوعہ نول کشور) چون کہ تعداد صفحات لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی اور مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی پتہ نہیں چلا ناظرین کرام میں کوئی مبصر توجہ فرما کر تکلیف اطلاع گوارا کرے تو راقم حروف بے حد مہنون ہو گا —

(۵) تراجم قرآن کے نمبر ۹ میں اعجاز القرآن مصنفہ مولوی ابوالحسن صدیقی مندرج ہے یہی نام اسی مصنف کے نام سے تفسیر میں درج ہے صرف فرق اتنا ہے کہ پہلی نظامی یک ایجنسی سے ۶ آنہ میں ملتی ہے اور دوسری ۲ آنہ میں مقنن دکن حیدرآباد میں چھپی ہے۔ اب اس صغریٰ و کبریٰ سے ناظرین جو چاہیں نتیجہ نکال لیں —

(و) فن تجوید میں نجوم القرآن - حرز الاصول الفروع - رموز القرآن -

وجوہ الہثانی۔ آداب قرآن کے نام بھی موجود ہیں جن کو فنِ قراءت سے کوئی واسطہ نہیں —

(ز) علم اخلاق کی بعض کتابوں کے نمونے یاد رکھنے کے لایق ہیں —
شیشے کی پری۔ جو مافگو۔ اخلاق کاشی۔ آئینہ ہند۔ باغ بہاری۔
جی گہام۔ کجکول بجوا۔ لال چندریکا۔ پریس باغ۔ ان کتابوں کے
ساتھ چند خاص کتابیں اور ہیں جن کا نمونہ نمبر ۶ میں دیکھا
جائے اور پھر اس سنگم کے جوڑ کی خوش ربطی کو سراہا جائے —
(ح) تاریخ انگلستان کے عنوان میں تاریخِ روم بھی شامل ہے اور
ایران کی سیاسی تاریخوں کے ساتھ شعرا لجم میں جو عذوبت ہے
اس کی داد دینے سے لب چپکتے ہیں —

(ط) تصوف ہنود پوتھی گیان پرشاد سے شروع ہوتا ہے اور ارتقائی
معراج معرفت پاتا ہوا فصوص الحکم اور دریائے حقیقت سے عبور
گزرتا ہے پھر رسالۂ شرافت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس عنوان میں
جس صنعت تعطیل سے کام لیا گیا ہے اس کا تذکرہ نمبر (۷) میں ہوگا —
(ی) اور فنون کے مقابل میں نسبتاً تاریخ کے مختلف شعبے دکھائے
ہیں اور کوشش کرنی چاہی ہے کہ ہر طبقے کی تاریخ جدا جدا
دکھائی جائے مگر اس میں جو کمال کیا گیا ہے وہ بغیر اصل
کتاب کے دیکھے ہوئے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ المختصر بہت سے
شعبے لکھتے لکھتے جب تھک گئے ہیں تو ایک عنوان ”تواریخ
کی مختلف کتابوں“ کا قائم کیا ہے۔ اس ذیل میں جو غیر معروف
و غیر متحقق یعنی متفرق کتابیں درج کی گئی ہیں اُن میں
چند کے نام یہ ہیں:۔ تاریخ عالم۔ تاریخ الکملہ۔ تاریخ چترال۔
تاریخ چین۔ سلسلۃ الہلوک (سرسید) تاریخ امریکہ کامل —
(۲)

اس مد میں ناظرین نے مرزا حیرت کی تفسیر القرآن اور مقدمہ تفسیر القرآن
کا حال پڑھا ہے۔ اس سے زیادہ معلومات بڑھانی ہے تو خطبات احمدیہ۔
اور تفسیر قرآن مولفہ سرسید احمد خاں دیکھے لیجئے۔ اس سے زیادہ ورق
گردانی کو جی نہیں چاہتا —

(۳)

(الف) سیرۃ النبی (مولانا شبلی) جس کے دو حصے الفہرست کے شائع

ہونے سے پہلے چھپ چکے تھے اُن میں سے صرف حصّہ اول لکھا ہے اور اُس کی قیمت مبلغ ۱۵ روپیہ لکھی ہے۔ حالانکہ ہر حصّے کی ۶ روپیہ عام قیمت ہے۔

(ب) مولود شریف شہید میں باوجود یکہ مؤلف کا تخلص موجود ہے مگر خائے مصنف و اشاعت وغیرہ کو خالی چھوڑا گیا ہے۔

(۴)

اس مد کی موجیں بے پناہ ہیں۔ ایک سلسلہ تاریخ ہی میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔

(الف) سیرۃ النبی کے عنوان میں منہاج النبوت دو جگہ۔ سوانح عمری آنحضرت بغیر نام مؤلف ۲ سے زیادہ جگہ۔

(ب) (صفحہ ۸۰۴) میں بذیل افشادِ درد محبت اور اردوے معلیٰ مکرر۔

(ج) تعلیم نسواں میں لائقِ اُستافی اور وکیل نسواں مکرر۔

(د) آثار الصنادید مکرر۔

(ه) سوانح مولانا روم مکرر۔

(و) البرامکہ مکرر۔

(۵)

کیا ناظرین متحیر نہ ہوں گے کہ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات میں ” الفاروق - موازنہ انیس و دبیر - سیرۃ النعمان - اور مولانا حالی کا دیوان اور غالباً حیات سعدی اور یادگار غالب بھی اس فہرست میں نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ چراغِ قلبِ اندھیرا کیا ہو سکتا ہے کہ خود مرزا صاحب نے بعض اپنی تالیفات کو نہیں درج کیا۔ مثلاً الاستدلال - تہذیبِ دید وغیرہ شاید اُزراءِ انکسار ایسا کیا ہو۔ حالانکہ الفہرست کے آخری پتے پر تمام تصانیف کا اشتہار مع قیمت موجود ہے۔

(۶)

غینۃ الطالبین مولفہ شیخ عبدالقادر جیلانی - فصوص الحکم - عوارث المعاریف - شیخ شہاب الدین - مآثر اکرام حضرت آزاد بلگرامی - وغیرہ اکثر کتابیں اصل مصنفین کے نام سے بغیر اطلاع ترجمہ موجود ہیں۔

(۷)

صفحہ (۱۰۷) سے جو کتابیں شروع ہوئی ہیں اُن میں پوتھی جانکا بھوں اگم سندیش - کبیر جوگ یادگار رام - امر گرتھہ - مقالات الاحسان فی مقامات الاعرفان -

کلمات صرفیہ غرضکہ سو۔ سو کتابیں صفحہ (۱۲۰) تک لکھی گئی ہیں مگر ان کا نہ کوئی عنوان ہے نہ کہیں شمار کا نمبر۔

(۸)

تاریخ کے عنوان میں پہلا شعبہ (سیرۃ النبی) ہے اس میں بھی مولود سعدی و مولود شہید وغیرہ موجود ہیں اور پھر اسی سے متصل سوانح عمری جناب رسول اکرم کا عنوان ہے وہاں بھی اسی قسم کی کتابیں دکھائی گئی ہیں اور ان دونوں سلسلوں کے بعد مولود شریف کا مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں پھر وہی مولودوں کی گردان۔ (سلو یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین)۔

(۹)

صفحہ (۱۶۰) کے عنوانی نمبر پر دس کا ہندسہ شمار نظر آئے گا مگر صفحہ (۱۶۱) پر بلا فصل ۶۱ تا (۱۰۱) شمار کے نمبر ہیں۔ حالانکہ صفحات (۱۶۰) و ۲۶۱ میں غلطی نہیں۔

(۱۰)

یہ خاتمے کا بند تو قیامت ہی کا مقطع ہے۔ علم اخلاق کے بائیسویں نمبر میں (تہذیب الاخلاق کی جلدیں) کتاب کا نام ہے۔ اس کے بعد مصنفین میں جلد اول معسن الملک۔ جلد دوم سر سید احمد خاں جلد سوم اعظم یار جنگ چراغ علی۔ جلد چہارم حالی ذکاۃ اللہ کے نام سے منسوب ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب اُردو اگر اس معنی کو آپ حل کر دیں تو اس کے معاوضے میں ایک سال کے لئے رسالہ اُردو کو کسی شوقین ادب طالع علم کے نام مفت جاری کرنے کے لئے چندہ حاضر کروں گا!۔

ان سطور تک الفہرست کے جن حقائق و خصائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس مجموعہ خوبی ہاے بے کراں کے کارناموں کی وضاحت انہیں نمبروں میں محدود ہے۔ یہ تو چند اور سرسری نہونے ہیں جو مبصرین حقیقت کے سامنے بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔ ورنہ یہ سلسلہ نامتناہی کرتے بعد اولی و مرتے بعد آخری برابر چلا گیا ہے۔ جس عنوان پر نظر ڈالئے ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ ان بدیہیات کے بعد جن باتوں کا پیش کرنا مقصود ہے وہ اگرچہ قیاسات پر مبنی ہوں گی مگر ایک وسیع النظر ماهر سمجھ سکے گا کہ یہ قیاسات مع الفارق نہ ہوں گے۔ جن کو حسب ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) الفہرست کس طرح مرتب کی گئی ہے اور اس میں ایسی بے ترتیب

لغزشیں کیوں رہ گئیں۔

(۲) جس قدر تعداد کتب اس فہرست میں دکھائی گئی ہے۔ معمولی اخباریں

باخبر علم الاعداد سے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس تعداد سے بہت زیادہ کتাবیں

بآسانی مل سکتی تھیں۔

(۳) ایک دو نہیں درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں اور مبالغہ نہ سمجھا جائے

تو ہزاروں مطبوعہ (اُردو) کتابیں اس فہرست میں مندرج نہیں جن کی طباعت

اس کی اشاعت سے بہت پہلے عام وجود میں شہرت پزیر ہو چکی ہے۔

(۱)

ترتیب کی بے ربطی اور عنوانوں کی عدم خانہ پری بتا رہی ہے کہ عموماً

کسی بک ایجنسی کی فہرست سے کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ یہ قیاس اس لیے

علم الیقین بلکہ حقایق کا مرتبہ پا سکتا ہے کہ ایک مرتب فہرست جو کافی

قابلیت تدوین رکھتا ہو اصل کتاب کو پا کر مہکن نہیں کہ اس کے مصنف کا نام

اور صفحات کی تعداد معلوم نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ دکان داروں کی فہرستیں

بکثرت صرف کتابوں کے ناموں اور قیمت کو بتاتی ہیں نہ کہ عموماً مصنفین کو۔

اس دعوے کی دلائل میں صفحہ ۲۵۳ کے عنوان سوانح عمری کو دیکھا جائے۔

جس میں (۵۱۷) کتابیں مندرج ہیں۔ مگر (۳۰۰) کتابیں ایسی ہیں جن کے مواف

نام معلوم اور قیمت معلوم۔ یہی صورت ناول کی فہرست میں ہے کہ (۶۰۰) سے زیادہ

کتابوں کے اسما درج ہیں۔ لیکن مجموعتاً (۱۹) صفحے ایسے ہیں جن میں بحز قیمت

اور بتے کے کوئی نشان نہیں۔ اب رہیں وہ کتابیں جن کے مصنفین کے نام

موجود ہیں تو ان میں بعض ایسی ہیں جن کے مصنف شہرت یافتہ ہیں

اور اشتہاری کتب فروش فروغ تجارت کے ایسے ان کے نام بھی لکھ دیتے ہیں

اسی کی نقل کافی سمجھی گئی۔ اور بغرض اگر کسی چھوٹے موٹے مقامی

کتاب خانے سے چند کتابیں لی گئی ہیں تو ان کے اندراج کی یہ شان نہیں ہو سکتی۔

ایسی فہرست کے مدون کا معمولی فرض تھا کہ واقعت عامہ کے لیے خانہ کیفیت

میں اس کتب خانے کا حوالہ دیا جاتا۔ ان کھلی ہوئی چشم پوشیوں کو دیکھ کر

ایسی لغزشوں کا سبب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جس کتب خانے سے فہرست کتب

لی گئی ہے اس کو کسی ایسے کم علم اور مہجول الحافظہ سے لکھوایا گیا ہے

جسے اپنی قابلیت و یادداشت پر اعتماد نہ تھا۔ بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ کتب خانوں

میں بعض مجلدات متعدد جمع ہو جاتی ہیں۔ ناقل نا عاقل نے فہرست لکھتے وقت

اس کا خیال بھلا دیا کہ یہ نقل ماک کے سامنے پیش ہونے والی ہے۔ اہاریوں میں جتنی کتابیں ملیں بلا استغناء مکررات ان کو لکھ لیا اور پھر وہی مسودہ مکھی پر مکھی مارنے کے لئے کاتبان مطبع کے حوالے کر دیا گیا۔ اگر کتابوں کا دیکھنے والا علمی ذوق سے نابلد نہیں اور وہ کتابوں کو معض اس لئے دیکھ رہا ہے کہ ان کی ایک مکمل فہرست اہل عام کے ہاتھوں تک پہنچانی ہے تو کیا کوئی غیبی الذہن بھی اصل کتابوں کو پا کر تعداد صفحات اور اسماء مصنفین کو چھوڑ سکتا ہے۔ غرض کہ اکثر عنواؤں میں مکرر درج ہو جانا اور اردو و فارسی کا امتیاز نہ کرنا اور مصنفوں کے ناموں کا نہ لکھنا ان قیاسات کو یقینیات بنانے کے لئے کافی ضحانت کر رہا ہے۔

(۲)

اس بات کے ثابت کرنے سے پہلے کہ الفہرست میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد بہت کم بتائی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ جس قدر مطبوعات اُس میں مندرج ہیں اُن کا شمار کیا جائے۔ اس مصیبت کے جھیلنے میں پھر لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔ یعنی مدون کی سہل انکاری اور بے پروائی سے ۸۱۵ صفحات کی کتابوں کو گننا ہوگا۔ جب کہیں یہ عقدہ حل ہو سکے گا۔ بہر حال سنگ آمد و سخت آمد جمع و تفریق ضرب و تقسیم کے بعد جس عطر سبھوے کو تحصیل حاصل سمجھ سکا وہ (۶۷۳۵) کے اعداد ہیں۔

اُردو زبان کی ابتدائی اور تصنیف و تالیف کی تاریخ سے قطع نظر کرتے ہوئے عام اہل خبر جانتے ہیں کہ ایست اندیا کمپنی کے تسلط سلطنت سے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت شروع ہوئی ہے اور فورت ولیم (کلکتہ) اور دہلی کی سوسائٹی (سنہ ۲۸۲۰ ع) کے وجود کے ساتھ طباعت کتب کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس سو سو سو برس کی مدت طویل میں رفتار مذاق دیکھتے ہوئے بالواسطہ کس قدر کتابیں چھپنی چاہئیں؟ اس کا سرسری اندازہ اُس یادداشت سے کرنا چاہئے جس کو جنوری سنہ ۱۹۲۱ ع کے رسالہ زمانہ (کانپور) نے اُردو کی قات اشاعت پر افسوس کے ساتھ ثبت کیا۔ ہے وہ فقرہ یہ ہے: ” ستمبر سنہ ۱۹۲۰ ع کی سہ ماہی میں ۷۲ کتابیں اُردو میں چھپی ہیں۔ “ اگر اسی سرمایہ اشاعت پر کفایت و قناعت کی جائے تو سو سو برس میں ۳۰ یا ۴۰ ہزار کتابیں شایع ہونی چاہئیں۔ لیکن مدون الفہرست نے اس قلیل تعداد اوسط کو بھی اتنا گھٹایا ہے کہ اگر مذکورہ بالا شمار کو صفر (۰) کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

راقم حروف کا یہ قیاس و گمان بھی علم الیقین اور حق الیقین سے کم نہیں جس کے اٹنے قطعی ثبوت و دلیل سنہ ۱۹۰۵ ع کی مردم شماری کی وجہ رپورٹ ہے جس کا خلاصہ اگست سنہ ۱۹۰۵ ع کے زمانے میں بایں الفاظ شایع ہوا ہے:—

”مردم شماری ہند کی رپورٹ میں ہندوستانی زبانوں کے متعلق جو یادداشت لکھی گئی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ ع تک اُردو ادب میں (۱۶۳۹۵) کتابیں شایع ہوئی ہیں اور مخصوص بخط اُردو (۱۰۸۷۹) چھپی ہیں۔ اتنی اشاعت کسی دوسری زبان میں نہیں“

سب جانتے ہیں کہ ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری تک دس برس کا زمانہ ہوتا ہے۔ الفہرست سنہ ۱۹۰۳ و ۱۹۰۴ کی مردم شماری کے بعد دوسری مردم شماری کے الگ بھگ حسب بیان مرالف دامن ترتیب میں کل اندازی شروع کر چکی تھی اور تیسری مردم شماری (سنہ ۱۹۲۱ ع) تک اپنی پر دامنی سے اس گلزار کو سدا بہار بنا چکی تھی مگر افسوس ہے کہ باوجود ذرائع معلومات مردم شماری کی رپورٹ دیکھنے کو بھی کسی بڑے کتب خانے کی سیر کا متراٹ سہجھا گیا—

(۳)

اس نمبر میں لفظی تمہید و تشریح زیادہ نہوگی بلکہ صرف یہ بتا کر کہ الفہرست کی ترتیب سنہ ۱۹۲۳ ع میں ختم کی گئی ہے۔ اس سے پہلے یعنی سنہ ۱۹۲۲ ع تک جتنی کتابیں اُردو میں شایع ہوچکی ہیں ان میں سے چند نام ایسے پیش کئے جائیں گے جن کا پتا نشان الفہرست میں نہیں اور اسی کے ساتھ یہ بتا دینا بھی ترفع بے محل نہ ہوگا کہ یہ کتابیں راقم الحروف کے حقیر کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اگر جناب مرزا صاحب کو حیدرآباد سے باہر جانے کی اجازت حاصل نہیں ہوئی تو بھی ممکن اور بہت ممکن تھا کہ اگر خاص بلدۂ فرخندہ بنیاد میں کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سر سالار جنگ بہادر اور دیگر اہل مذاق کے کتب خانوں امعان نظر سے دیکھتے تو اُن کتابوں سے چوگنا مجموعہ جمع ہو جاتا۔ میرا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی حیدرآباد میں کتابی سرمایہ کافی تعداد میں موجود ہے بشرطیکہ کوئی تہو نقدنے والا فیاریا بن کر چھان بین کرے۔ جس صورت میں یہ فہرست

پیش کی گئی ہے افسوس کہ اُس کی کوئی حیثیت نظر میں نہیں جچتی۔ عنوان۔ خانہ پری۔ کاغذ۔ طباعت وغیرہ وغیرہ جس چیز کو دیکھا جاتا ہے نقص سے خالی نہیں۔ کاش بانکی پور لائبریری کی مطبوعہ فہرست ہی سے مدد لی گئی ہوتی تو غالباً کتابوں کی تعداد میں اتنی کمی اور خانہ پری میں اس قدر سادگی نظر نہ آتی۔ راقم حروف اگرچہ اس وقت تک مرزا صاحب کے تعارف ظاہری سے فیض یاب نہیں مگر اُردو کے سلسلہ خدمت کی بدولت بکثرت نہ سہی تو بقات ان کی قابلیت سے آگاہ ہے۔ جس مفید ضروری اور مہتم بالشان کام کو انہوں نے اپنے ذمے لیا تھا وہ ہر طرح اُن کے لئے شایان شان تھا مگر حیرت ہے کہ ایسے کار نامے کو جس چار جامے کے ساتھ حلیۂ انطباع بخشا گیا ہے اُس کی کسی ادا میں کوئی حسن نہیں پایا جاتا۔

اب میں اپنے معجزۂ عنوانی نقشہ کے ساتھ بغیر ترتیب فن چند کتابیں پیش کر کے رخصت ہوتا ہوں:—

(نقشہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصحف	تعداد صفحات	مطبع	سلف اشاعت	کیفیت
۱	ریاض الانوار حصہ اول	تذکرۃ اولیا	حافظ محمد عمر دہلوی	۱۲۰۰ھ	۲۰۸	نصرت المطایع دہلی	۱۲۰۲ھ	سلف اشاعت
۲	ایضاً جلد دوم	تذکرۃ اولیا	حافظ محمد عمر دہلوی	۱۲۰۰ھ	۱۰۸	حدیقۃ العلوم میرتھہ	۱۲۰۵ھ	
۳	تاریخ بلگرام ۲ حصہ	تاریخ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۲۰۳ھ	۱۷۲	نور الانوار آرا	۱۲۰۱ھ	
۴	عقد نوپا	عسلیات	سید عابد حسین لکھنوی	۱۲۰۳ھ	۵۵	نور لکھنور لکھنؤ	۱۲۰۲ھ	
۵	سخن بے مثال دیوان شیخ لکھنوی	دیوان	شیخ محمد جان شاد	۱۲۰۱ھ	۱۷۳	نصیر عاتق پریس لکھنؤ	۱۲۱۸ھ	
۶	گوھر آبدار	دیوان	منور خان گوھر مد راسی	۱۲۰۳ھ	۷۲	مطبع سلطانی مد راس	۱۲۲۳ھ	
۷	آردو کا گلدستہ	نظم	سید امجد علی اشہری	۱۲۰۵ھ	۷۲	مطبع آگرہ اخبار	۱۲۰۵ھ	
۸	جلوہ کاغذات	اخلاق	مرروی عبدالرحمن کلیانی	۱۲۰۵ھ	۲۰	کریم المطایع بیتور	*	سلف اشاعت
۹	نبہالِ وضع اکبر (رحمت پبلیشر)	دیوان نعت	محمد اکبر خاں اکبر میرتھہ	۱۲۰۲ھ	۸۰	نامی پریس میرتھہ	۱۲۰۲ھ	اصل کتاب میں نہیں ہے مگر یہ مصحف اسی زمانے کے ہیں
۱۰	دیوان افسر	دیوان	بشیر الدین افسر اورنگ آبادی	۱۲۱۱ھ	۷۳	مطبع ضمیر اورنگ آباد دکن	۱۲۱۲ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصحف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سلسلہ اشاعت	کیلیت
۱۱	ملاصرہ	نظم مقلبت	حافظ منیر الدین فیہا	۱۲۲۳ھ	۲۲	مفتی الاسلام حیدر آباد دکن	۱۲۲۳ھ	کلیات شیعہ و حسرتی تذکرۃ المصلحا (تاریخ احسن) •
۱۲	تفسیر ۶ بہا	نظم	پتیمبر پرشاد اختر اجیری	۱۹۰۳ع	۲۸	مطبع رضوی دہلی	۱۹۰۳ع	
۱۳	گلزار سقن	ادب شاعری	چکنا تہ پرشاد فیض کھنڈر	۱۲۲۶ھ ۱۹۰۸ع	۶۸	نور کشور لکھنؤ	۱۲۲۶ھ	
۱۴	تاریخ بدیع	مثنوی	امیر المہ تسلیم	۱۲۹۸ھ ۱۸۸۱ع	۳۵۲	مطبع حسلی رام پور	۱۲۹۸ھ	
۱۵	کان تاریخ	مطایع تاریخ	رام پرشاد شاہجہان آبادی	۱۲۹۲ھ	۱۶۰	مطبع انوری آگرہ	۱۲۹۲ھ	
۱۶	کلام مہر	نظم	سورج نرائن مہر	۱۹۰۸ع	۲۲۲	مطبع عام لاہور	۱۹۰۸ع	
۱۷	صغیر بلبل	دیوان	سید فرزند احمد صفیر بائعرا سی	۱۲۷۳ھ	۱۶۸	عظیم المطابع پٹنہ	۱۲۸۰ھ	
۱۸	ارمغان عزیز	دیوان	نواب عزیز یار جنگ	۱۲۳۶ھ	۲۲۵	شوکۃ السطایع حیدر آباد دکن	۱۲۳۶ھ	
۱۹	آنا والشعرا	تذکرۃ شعرا	سید مستقا علی بہاری	۱۳۰۲ھ	۲۶۹	مطبع شاہجہانی بہوپال	۱۳۰۷ھ	
۲۰	کلیات شیعہ و حسرتی تذکرۃ المصلحا (تاریخ احسن)	دیوان	نواب مصطفیٰ خاں شیعہ	۱۸۶۹ع	۱۲۲	نظامی پریس بداپور	۱۹۱۶ع	
۲۱		تاریخ	مولوی عبدالحی بدایونی	۱۳۳۰ھ	۶۶	ایضاً	۱۳۳۰ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فہم	مصنف	زمانہ مصحف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۲۲	کیفیت تشریف آوری امیر کابل	تاریخ	مسلمانان مدرسۃ العلوم علی گڑہ	۱۹۰۷ء ۱۳۲۲ھ	۲۵	انسٹیٹیوٹ پریس علیگڑہ	۱۹۰۷ء	
۲۳	سالانہ رپورٹ چانڈا مدرسۃ العلوم علی گڑہ	تاریخ	کارکنان مدرسۃ العلوم علی گڑہ	۱۹۱۲ء	۲۳	ایضاً	۱۹۱۲ء	
۲۴	خطبات الاسلام للجمہ والایام المعظم	فقہ	مولوی یونس خاں دناولی علی گڑہ	۱۳۲۰ھ	۳۲	مطبع احمدی علیگڑہ	۱۳۲۰ھ	
۲۵	چراغ سقین (رسالہ عروض)	عروض	مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی	۱۹۱۵ء	۹۶	گلشن ابراہیمی لکھنؤ	۱۹۱۵ء	
۲۶	رسالہ کانفرنس نسیم ۷	لکچر	مجاہدۃ آفتاب احمد خاں	۱۹۱۱ء	۷۶	ریاض ہند علیگڑہ	۱۹۱۱ء	
۲۷	معاریات ترک باطالیہ	مسند سن (نظم)	غلام حضرت خاں حافظ	۱۹۱۳ء	۲۸	نورکشور لکھنؤ	۱۹۱۳ء	
۲۸	تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ	تاریخ	سید اولاد حسین رفیق بلگرامی	۱۹۱۵ء	۴۱۶	مطبع اکبری پٹنہ	۱۹۱۵ء	
۲۹	سرا سکتون ترجمہ سوالما لکھن	اخلاق	سید مستن علی حسین نظامی	۱۳۲۹ھ	۲۰۴	رقاعہ عام استقام پریس لاہور	۱۳۲۹ھ	
۳۰	قانون تصوف حصہ اول	تصوف	ملکچر انجمن خدام الصوفیہ لاہور	۱۳۲۲ھ	۲۰	فیض عام لاہور	۱۳۲۲ء ۱۹۰۷ء	
۳۱	کلیہ المعارف	تاریخ	مولوی رفیع الدین بدایونی	۱۳۱۹ھ	۲۱۲	نظامی پریس بدایون	۱۳۱۹ء	

شمار	نام کتاب	فنی	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحات	مطبع	سلسلہ اشاعت	کیفیت
۳۲	تاریخ فرخ آباد ۲ حصہ	تاریخ	ولیم آر وین سی ایس فتح گڑہ	۱۹۰۲ء	۳۹۱	* افضل السباعی دہلی	۱۲۲۲ء	* اصل کتاب پر مطابع وغیرہ کا نام نہیں ہے۔
۳۳	تذکرۃ الانساب	تذکرۃ ارباب	مولوی سید امام الدین گلشن آبادی	۱۲۲۲ء	۱۶۰	تومی پریس لکھنؤ	۱۲۰۶ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ آزاد دارج ہے۔
۳۴	دیوان اول یاس	دیوان	مہر ذاکر حسین یاس لکھنوی	۱۲۹۲ء	۲۳۰	مفید عام آگرہ	۱۲۱۰ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ آزاد دارج ہے۔
۳۵	قواعد منتخب	قواعد	نواب صفدر علی خان رام پوری	۱۲۰۳ء	۳۲	مطبع قومی لکھنؤ	۱۲۱۰ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ آزاد دارج ہے۔
۳۶	گلستہ معرفت	مثنوی	شیخ محمد ابراہیم ذوق	۱۲۰۹ء	۹۶	مطبع ناسی لکھنؤ	۱۲۱۰ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت
۳۷	دیوان ذوق †	دیوان	اسد اللہ خان غالب	۱۲۸۱ء	۷۲	ایضاً	۱۲۰۸ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت
۳۸	دیوان غالب †	ایضاً	ارشاد علی خان قلی	۱۲۸۹ء	۲۰۲	نور لکھنؤ کانپور	۱۲۲۹ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت
۳۹	مظہر عشق	ایضاً	شہزادہ ناصر حسین حقیقہ عظیم آبادی	۱۳۱۹ء	۲۰۷	احسن المطابع پٹنہ	۱۳۱۷ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت
۴۰	نظم دلفریب	نظم	حکیم علی حسین صدیر لکھنوی	۱۹۱۰ء	۲۸	مفید عام پریس لکھنؤ	۱۹۱۰ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت
۴۱	چشمستان صدیر	نظم	حکیم علی حسین صدیر لکھنوی	۱۹۱۰ء	۲۸	مفید عام پریس لکھنؤ	۱۹۱۰ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت
۴۲	باغ جہاں اکبر (دیوان اکبر)	دیوان	اکبر علی خان افسوس و اکبر آگرہ *	۱۹۱۰ء	۹۶	ابوالعلائی آگرہ	۱۹۱۰ء	† الطہرست میں صرف مرتبہ نظامی و خسروت

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانه مصنف	تعداد صفحات	مطبع	سنة اشاعت	کتابت
۳۳	دہاض نواس (کلام اطہر)	دیوان	غلام مصطفیٰ خان اطہر جل گانوں	۱۲۲۷ھ	۱۳۲	مطبع حقانی دہلی	۱۲۲۷ھ	
۳۴	نہکر سفین	نثر	احسان اللہ عباسی	۱۹۱۱ء	۲۷۲	مطبع حکیم برہم و غیرہ	۱۹۱۱ء	
۳۵	آیات الاحکام	فقہ	مولوی عبدالملکی نگرانی	۱۲۹۲ھ	۲۱۸	مطبع علوی مکتبہ بلہرہ	۱۲۹۲ھ	
۳۶	الکلمۃ الملبیۃ الاطہر علم المصطفیٰ	کلام	مولوی نعیم الدین مراد آبادی	۱۲۲۷ھ	۱۲۸	شمس المطابع مراد آبادی	۱۲۲۷ھ	
۳۷	قصص العرب	تاریخ	ہادی حسین ہادی، بھارسی	۱۹۱۱ء	۵۸	سلیمانی پریس بنارس	۱۹۱۱ء	
۳۸	انھاء جدید	انصاف	عبد السلام زبیدی	۱۹۰۸ء	۶۲	نظامی پریس بداپور	۱۹۰۸ء	
۳۹	سفینۃ نوح	دیوان	محمّد نوح نادرہ	۱۲۲۹ھ	۲۲۵	استغفر رب پریس الہ آباد	۱۲۲۹ھ	
۴۰	مہلہ معصومین	مراتی و مغلّیت	سید فرزندان احمد صفدر بلکرامی	۱۹۱۲ء	۳۱۵	عزیزی پریس اگرہ	۱۹۱۲ء	
۴۱	دیوان حافق	دیوان	ملشی فقیر الدین حافق برہان پوری	۱۲۲۲ھ	۸۰	ابوالمطلبی پریس اگرہ	۱۹۰۶ء	
۴۲	دیوان فروغ	دیوان	سید امیر حسین وکیل حیدر آباد - دکن	۱۲۲۵ھ	۲۵۳	کاشن فیض الکثیر	۱۹۰۷ء	

نمبر شمار	نام کتاب	فہم	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحات	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۶۳	پروہان لائحہ فی تحقیق امر آذ مائے	فقہ	مولوی سید قمر الدین احمد	۱۵۳ھ	۱۵۳	مطبع نظامی گان پور	۱۹۹۲ھ	* بہارستان سنی کے نام سے ایک کتاب مطبوعہ نول کشور
۶۵	بہارستان سنی	دیوان	ناسخ و آتش و آباد لکھنوی	۱۹۹۳ھ	۲۵۹	مطبع محمدی لکھنؤ	۱۹۹۳ھ	نول کشور
۶۶	حیات و ارت	سوانح عسری	مرزا محمد معلم بیگ	۱۹۹۱ھ ۱۳۳۲ھ	۷۲	مطبع حکیم برہم گورکھپور	۱۹۹۱ھ	الہدست میں درج ہے مگر
۶۷	طلب صادق	ناول	حاجی محمد خاں خوجوی	۱۸۹۹ھ	۱۰۴	خادم الاسلام پریس دہلی	۱۸۹۹ھ	وہ یہ کتاب نہیں ہے —
۶۸	نہدید اللہودۃ	مباحثہ	سید شاہ محمد حسین یگنوی	۱۳۱۵ھ	۵۰	مطبع حنفیہ بنگلہ	۱۳۱۵ھ	
۶۹	تواریخ مہین	قصائد تاریخی نظم	سید محمد مہدی کمال لکھنوی	۱۳۲۲ھ	۵۴	مطبع تصویر عالم لکھنؤ	۱۳۲۲ھ	
۷۰	حدیثہ شہد +	حالات بزرگان	میرزا جان لکھنوی	۱۲۷۲ھ	۷۰	مطبع قدیم لکھنؤ	۱۲۷۲ھ	+ ذکر جہاد و لوی امیر الدین علی
۷۱	سیف الاسلام	مباحثہ نصاریٰ	سید فتح علی بخاری	۱۲۸۷ھ	۴۰	لائٹ پریس بنگارس	۱۲۸۷ھ	
۷۲	تصدیق الاسلام	مباحثہ نصاریٰ	سید فتح علی بخاری	۱۲۸۷ھ	۳۸	لائٹ پریس بنگارس	۱۲۸۷ھ	
۷۳	ہفت کونسل (د ریہہ)	مباحثہ نصاریٰ	حکیم محمد حسن امروہوی	۱۲۹۱ھ	۳۲	مطبع متحدہ دہلی	۱۲۹۱ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۷۶	ہفت جلسہ معلم الحساب معروف بہ معکب نامہ	ملاحظہ حساب قواعد	نعمان خان وکیل مولوی مسیح الزمان سید قزند احمد صغیر بلکراسی	۱۲۹۳ھ	۲۲	انوار محمدی راے بریلی مطبع مسیحانی لکھنؤ *	۱۲۹۳ھ	* قدیم چھاپہ قدر سے بنائے گاہے اس نام کی جو کباب الفہرست میں درج ہے وہ کوئی اور ہے۔
۷۷	رشتحات صغیر	دیوان	مرزا فدا علی منن لکھنوی	۱۲۹۳ھ	۲۹۲	مطبع نورالانوار اردہ	۱۲۹۳ھ	
۷۸	گلشن منن	تاریخ گوتی	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۳۲	مطبع قہس احمدی لکھنؤ مطبع نیراعظم مراد آباد	۱۲۲۷ھ	
۷۹	عدن العارین	سوانح عسری	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۳۲۹	نامی پریس گان پور	۱۲۲۷ھ	
۸۰	العارق	سفرنامہ	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۳۱۲	پبلشیا پریس سیالکوٹ	۱۲۲۷ھ	
۸۱	عجائبات امریکہ	تاریخ	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۲۰۸	مطبع دہلی *	۱۲۲۷ھ	
۸۲	فاطمی دعوت اسلام	سوانح	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۲۲۲	اصح المطابع لکھنؤ	۱۲۲۷ھ	
۸۳	واقعات انیس	واضع	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۱۷۵	دائرۃ ادبیہ لکھنؤ	۱۲۲۷ھ	
۸۴	میلے سقن	واضع	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۲۹۷	مطبع عام پریس لاہور	۱۲۲۷ھ	
۸۵	جامع القواعد	واضع	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۲۹۷	مطبع عام پریس لاہور	۱۲۲۷ھ	
۸۶	جامع القواعد	واضع	ملشی انوار حسن تسلیم سہسوانی شمس العطاء مولوی شہلی نعمانی	۱۲۲۷ھ	۲۹۷	مطبع عام پریس لاہور	۱۲۲۷ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحات	مطبع	سالہ اشاعت	کیفیت
۸۷	معین الشعرا	قواعد شاعری	میر محمد علی خان ناظم	۱۲۲۳ھ	۱۱۲	مطبع صاحب دکن حیدر آباد	۱۲۲۳ھ	
۸۸	تاج ستین	دیوان	حافظ جلیل حسن جلیل	۱۹۱۰ء	۳۶۲	مطبع اختر دکن حیدر آباد	۱۹۱۰ء	
۸۹	جان ستین	دیوان	حافظ جلیل حسن جلیل	۱۳۲۲ھ	۲۶۶	امیر المطابع حیدر آباد - دکن	۱۰۱۶ء	
۹۰	دیوان وحشت	دیوان	رضا علی وحشت کلکتہ	۱۳۲۷ھ	۱۲۷	مطبع ستا، کلکتہ	۱۳۲۸ھ	
۹۱	رسالہ عقیدہ	فقہ	محمد نظام	۱۲۷۸ھ	۲۲	مطبع نظامی کانپور	۱۲۷۸ھ	
۹۲	تذیبہ السہال بالہام الہیہ سما السعالم	مناظرہ	مولوی حافظ بخش	۱۲۹۱ھ	۱۰۲	مطبع بہارستان کشمیر لکھنؤ	۱۲۹۲ھ	
۹۳	دیوان مستروح	دیوان	میر مہدی حسن مستروح دہلوی	۱۸۹۹ء ۱۳۱۶ھ	۲۲۸	سرفراز پریس دہلی	۱۸۹۹ء	
۹۴	دیوان عزیز	دیوان	مولوی حافظ عبد العزیز خاں بریلوی	۱۸۹۳ء ۱۳۱۱ھ	۲۶۲	مطبع شریکت الاسلام لکھنؤ	۱۸۹۳ء	
۹۵	کاشف الصحافی جلد دوم*	ادب شاعری	نواب امداد امام اتر	۵۳۹		کاروبار پریس لکھنؤ		* اس کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے۔
۹۶	میقاتیہ بہقرون	دیوان	عبد العزیز بہقرون دہلوی	۱۳۱۳ھ	۳۰۰	مستقیم پریس دہلی	۱۹۱۰ء	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سال اشاعت	کیہیت
۹۷	روضۃ الکرام بلگرام شعیرۃ سادات بلگرام	انساب	سید رمی الحسن بلگرامی	۱۹۲۰ع	۲۳۶	مطبع حکیم ذہم گورکھپور	۱۹۲۰ع	
۹۸	حل غوامض	لفظ	مولوی سید محمد عبدالمہ بلگرامی	۱۸۸۶ع	۲۵۲	مطبع احمدی گان پور	۱۸۸۶ع	
۹۹	موازنۃ انیس و دہیر* السیوران	تذکرہ	مولوی شہلی نعمانی	۱۹۱۰ع	۲۸۲	انوار السامع لکھنؤ	۱۹۲۱ع	* یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔
۱۰۰	دیوان غالب جدید نسخۃ حمید یہ	تذکرہ	سید نظیر الحسن رضوی	۱۹۱۲ع	۶۱۰	فیض عام علیگڑہ	۱۹۱۲ع	
۱۰۱	دیوان غالب جدید نسخۃ حمید یہ	دیوان	مولف منشی انوار الحق	۱۹۲۱ع	۳۲۲	مہمد عام آگڑہ	۱۹۲۱ع	
۱۰۲	جلوۃ خضر حصۃ اول	تذکرہ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۳۰۲ھ	۳۰۸	نور الانوار آگرہ	۱۸۸۵ع	
۱۰۳	ایضاً حصۃ دوم	تذکرہ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۹۰۲ع	۲۸۲	نور الانوار	۱۸۸۵ع	
۱۰۴	شرح دیوان غالب	دیوان	مولوی سید علی حیدر طیاباٹائی	۱۹۰۸ع	۳۲۸	مہمد الاسلام حیدرآباد دکن	۱۹۰۸ع	

جہاں تک امکان کی معمولی حد تھی الفہرست کے اوراق ایک ایک کتاب کے مقابلے کی غرض سے اُلٹے پلٹے اکٹھے ہیں۔ اتنی ورق گردانی کے بعد بھی اگر کوئی کتاب اس نمونے میں ایسی درج ہو گئی ہو جس کا وجود الفہرست میں موجود ہے تو راقم حروف کو انساں سمجھا جائے نہ فرشتہ آسمان۔

یہ چند کتابیں محض نمونے کے لئے پیش کی گئی ہیں جن میں ہر قسم اور ہر فن کی چھوٹی بڑی کتابیں موجود ہیں اگر خاکسار صرف اپنے چھوٹے سے کتب خانے ہی کی فہرست پیش کرے تو بلا مبالغہ الفہرست کی ایک چہارم ضخامت درکار ہوگی جس کے لئے نہ اب وقت ہے نہ اس نمونے کے صحیح مان لینے پر آئندہ ضرورت۔ بالآخر اس شعر پر خاتمہ ہے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز دامن گلہ دار

احسن مارہروی
اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ



گوہرین نامہ

مولوی احسن اللہ خاں ثاقب پروفیسر عربی و فارسی و کتوریہ کالج
ٹوالیار ادبی دنیا میں دیرینہ روشناس ہیں اور یہ گوہرین نامہ عربی
فارسی۔ اُردو میں آپ کے خیالات و مقالات۔ مکتوبات اور کلام نظم کا مجموعہ ہے
اکثر اصناف سخن پر حاوی اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دل چسپ۔ نیز بعض
ادبی و علمی معلومات کے لحاظ سے مفید و پر لطف ہے۔ ثاقب صاحب کی عمر
اس وقت ۶۲ سال کی ہے۔ آپ کو ہمیشہ ادبی ذوق اور ادبیات سے دل چسپی
رہی۔ ہندوستان و ایران کے اکثر نامور ہم عصر شعراء و ادباء سے دل چسپ
و پر لطف صحبتیں رہیں اور اکثر و بیشتر نے اعتراف قابلیت کیا ہے۔ آپ کی
زندگی کے قابل ذکر کارناموں میں رسالہ قند پارسی ہے جو ماہانہ علی گڑھ سے

نکلتا رہا۔ اُردو میں مکتوبات امیر مینائی مشہور تالیف ہے۔ دیوان فارسی ہنوز طبع نہیں ہوا۔ حاشیۂ اصطراب دیوبند کے مشہور مدرسۂ عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ دیباچۂ انتخاب دیوان فیضی فیاضی - شرح حسن و عشق عالی شیرازی بھی قابل تذکرہ ہیں۔

گوہرین نامہ میں صفحہ ۱۴ سے ۳۴ تک مکتوبات فارسی ہیں جو مولف نے سنہ ۱۸۹۴ع سے سنہ ۱۹۱۶ع تک مختلف احباب کو لکھے۔ جن میں قدیم فارسی انشا پردازی کی شان پوری طور پر نمایاں ہے۔ پھر ۱۲۳ صفحہ تک مختلف تقریظیں۔ خطبات۔ دو تین مضامین اور کچھ وہ خیالات و واردات ہیں جو وقتاً فوقتاً بعض کتابوں کے دیکھنے یا کسی اور محرک کے وجہ سے پیدا ہوئے اور بیاض میں ٹانک لٹے گئے تھے۔ یہ حصہ بہت دل چسپ اور جدت کا پہلو لٹے ہوئے ہے۔ اس سے مولف کے صحیح خیالات و جذبات۔ بعض کتب اور اشخاص کی نسبت رائے۔ معاصرین و احباب سے مراسم و تعلقات وغیرہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ مولف صاحب کی ملاقات ہندوستان کے کن کن بزرگوں سے کن کن مقامات میں ہوئی ہے۔

صفحہ ۱۱۴ سے ۱۳۷ تک حصۂ نظم فارسی ہے۔ اس میں قصائد۔ قطعات۔ غزلیات وغیرہ ہیں اور کلام کی پختگی۔ سلاست ذوق اور متانت بیان ہر جگہ نمایاں ہے پھر چند عربی مکتوبات ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم طرز کے اچھے خاصے ادیب ہیں۔ ان سب کے بعد کچھ اُردو مکتوبات۔ دو ایک مضامین پھر چند دیباچے ہیں جو مولف صاحب نے بعض کتب پر لکھے ہیں۔ اس کے بعد اُردو کلام ہے جس میں غزلیں زیادہ ہیں۔ اگرچہ ثاقب صاحب کا اصل ذوق فارسی ہے۔ اُردو میں بہت کم لکھا اور کہا ہے۔ مگر جو کچھ کہا اور لکھا ہے اس میں بھی پختگی بیان۔ صحت زبان۔ سلاست ذوق۔ متانت و سنجیدگی کا عنصر آشکارا ہے۔ پھر حال یہ مجموعہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اس سے مولف کی تینوں زبانوں میں قابلیت۔ مولف کے رجحان طبیعت۔ ذوق ادب اور سوانح زندگی۔ جذبات و خیالات سب کچھ معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کتاب میں مولف کے نام ہندوستان و ایران کے مشاہیر کے چند مکتوبات تینوں زبانوں میں ہیں۔ جن سے ان بزرگوں سے ثاقب صاحب کے مراسم محبت اور ثاقب صاحب کی نسبت ان کی رائیں اور اعتراف قابلیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہی شاید ان کو شامل کرنے کا منشاء بھی ہے۔ ان بزرگوں میں مولانا حالی۔ شبلی۔ وقار الہک مرحوم۔ حکیم اجمل خان۔ مولانا عہادی۔ اذیتر چہرہ نما مصر۔ ایران۔ اصفہان اور شیراز کے بعض اذیتروں کے

خطوط ہیں۔ گویہ سب ذاتی (پرائیوٹ) ہیں اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شایع ہوں گے تاہم ان سب میں کچھ نہ کچھ دل و دماغ کے لئے سامان تفریح و دل چسپی موجود ہے۔

گوہرین نامہ کی لکھائی چھپائی کاغذ بہت معمولی ہے۔ حجم ۲۱۴ صفحے قیمت صرت ۱ روپیہ ۴ آنہ غالباً مولف صاحب یا معہد حسن صاحب علوی مالک افوار المطابع لکھنؤ سے ملے گا۔

(م)

مثنوی اسرارِ ہستی

(اس کے مصنف سید ضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی

تلمیذ جناب حافظ پہلی بھیتی ہیں)

یہ مثنوی مضامین حقیقت و معرفت پر مشتمل ہے اور بصائر کے عنوان

، میں شروع ہوتی ہے:۔

چمن میں ہے کیا بہار دیکھو	چمن ہے کیا لالہ زار دیکھو
نکلتنی ہے دل سے خود بخود واہ	زبان کہتی ہے الہ الہ
وہ خوشنوا ہیں طیور گویا	وہ پیارا پیارا ہے اُن کا نغما
کہ معو ہو جائے سننے والا	رہے نہ کچھ ہوش تن بدن کا
یہ پھول پتے مہکنے والے	یہ بیل بوٹے طرح طرح کے
کھلائے کس نے اگائے کس نے	دکھائے کس نے سنگھائے کس نے
یہ چھوٹی چڑیاں چہکنے والی	یہ ننھی کلیاں مہکنے والی
چپک رہی ہیں مہک رہی ہیں	بھدک رہی ہیں چپک رہی ہیں

آگے چل کر مسائل وحدانیت-وحدت وجود-سوفسطائیت-مادیت-ثنویت

(بت پرستی) اور تثلیث پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ پھر ان پر تبصرہ ہے۔

وجدانی باتیں اور حقیقت خدا شناسی وغیرہ پر عمیق مضامین ہیں۔ آخر میں

عروس وحدت اور تبسم کے عنوان سے دو نظمیں ہیں۔

جناب گویا کا کلام بے عیب۔ زبان عمدہ۔ بیان دل کش ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحے

تقطیع چھوٹی ۲۰ × ۱۶/۳۰ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس قیمت کہیں

درج نہیں۔ مولوی سید ضامن حسین صاحب گویا محلہ احمدزئی پبلی بھیت

سے مل سکتی ہے۔

(م)

شراب عیش

یہ فاول قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ قاری صاحب ایک عرصہ سے ان معاشرتی پیچیدگیوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جو طبقہ طوائف کے بدولت آئے دن ہماری سماج میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ خالص اسی موضوع پر وہ پانچ افسانے سعید-سعادت-شاہد رعنا-سزائے عیش اور انجام عیش لکھ چکے ہیں اور زیر تبصرہ افسانہ اسی ”سلسلۃ الطوائف“ کی چھٹی کڑی ہے۔

طوائف اور ان کے حالات زندگی کو بطور موضوع تحریر یا تقریر میں پیش کرنا شرفاء کے طبقہ میں جیسا کچھ معیوب سمجھا جاتا ہے محتاج بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بدنصیب گروہ کی زندگی-اس کی تنظیمات اور روایات پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے اور ان چیزوں کی واقفیت کے بغیر نوجوانوں کی حالت درست کرنا اور اس قابل رحم طبقہ کی اصلاح کرنا دشوار ہے۔ مبتذل اور عامیانہ مباحث سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو ان لوگوں کی زندگی کے ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن پر سنجیدگی کے ساتھ خالص معاشرتی نقطہ نگاہ سے بحث ہو سکتی ہے اور اصلاحی تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ کی دوسری کتابوں کی طرح موجودہ کتاب بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

افسانے کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو بھی کتاب کافی دلچسپ ہے۔ شریف خواتین اور طوائف دونوں کی صاوت اور سچی تصویریں ہیں۔ جو کچھ بھی لکھا ہے قرین قیاس بنا کر لکھا ہے۔ پلاٹ اگر زیادہ گہرا نہیں ہے تو بعید از حقیقت بھی نہیں ہے۔ طوائف کی گفتگو-ان کے طور طریقے اور چالوں کا بیان جس انداز سے کیا گیا ہے وہ جناب مصنف کے گہرے مشاہدہ کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک چیز جس سے ہمیں اصولاً اختلاف ہے یہ ہے کہ کہیں کہیں نفس قصہ کو چھوڑ کر کئی کئی صفحات نصائح اور تجاویز کی نظر کٹے گئے ہیں۔ جب مصنف اس طرح قصہ سے الگ ہٹ کر نصیحت پر اُتر آتا ہے تو لطف باقی نہیں رہتا۔ مصنف کا فرض ہے کہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ پس پردہ رکھے اور قصہ کو خود اپنے اخلاقی نتائج پیدا کرنے دے۔ زبان پر کوئی اعتراض نہیں۔ دلی کی صاوت ستھری بول چال ہے البتہ کہیں کہیں انگریزی ساخت کے جملے نظر آتے ہیں

جیسے: —

صفحہ ۴ (۱) ”میں نے آپ کی اس زیادتی کو بھلا دیا کہ باوجود دوسرے شخص کو چاہنے کے آپ نے مجھ سے بھی اظہارِ تعشق کیا جس

کو میں اپنی غلطی سے سچ سمجھا۔“

صفحہ ۴۲ (۲) ”عشرت کو اپنے پیشہ کی جہلہ روایات میں بہت تندہی کے ساتھ پرورش کیا“ ایک مقام پر لکھا ہے ”بڑی طوائفوں سے رسائی ہے“ ہماری رائے میں ”سے“ کی بجائے ”تک“ زیادہ مناسب ہوتا۔

سرورق رنگین۔ کاغذ لکھائی چھپائی غنیمت ہے۔ دفتر تمدن متیا محل دہلی سے دس آنہ میں مل سکتی ہے۔

(و)

بہرام کی دھائی

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ظفر عمر صاحب نے ایک قصہ فیلی چھتری اور دوسرا بہرام کی گرفتاری کے نام سے لکھا تھا۔ ان دونوں قصوں کی خاصی شہرت ہو چکی ہے۔ یہ اس قصے کا بقیہ حصہ ہے جسے مرزا باقر حسن صاحب موزوں نے مکمل کیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہاں کیا ہے کہ اُسی رنگ میں اس قصے کا خاتمہ کیا ہے دل بہلانے کے لئے اچھی چیز ہے اور جو لوگ سراغِ رسائی اور مجرم اور پولیس کے داو گھاتوں کو شوق سے پڑھتے ہیں اُن کی دل چسپی کے لئے یہ خوب کتاب ہے۔

جنگلہین بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے ایک روپیہ چار آنے میں مل سکتی ہے۔

فطرت نسوانی

یہ کتاب مطبوعات صوفی کی ۶۹ ویں کڑی ہے۔ یہ اصل میں ایک فرانسیسی پروفیسر اخلاقیات ہنری ماری کی تصنیف ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ امیل زیدان صاحب ادیٹر الہلال نے کیا تھا اور اب ملک کے مشہور اہل قلم مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے مذکورہ بالا نام سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

کتاب میں نسوانی مسائل پر بہت خوبی سے بحث کی گئی ہے۔ گزشتہ زمانہ میں عورت کا سماجی رتبہ اس کی جسمانی حالت۔ اس کی نفسیاتی خصوصیات اور پھر زمانہ جدید میں اس کی آزادی کی تاریخ۔ یہ سب باتیں بہت کچھ تفصیل کے ساتھ درج کی گئی ہیں اور ان لوگوں کے لئے سبق آموز ہوں گی جو عورت کی زندگی اور اس کے مقصد پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں عورتوں کی سماجی حیثیت کے متعلق مختلف اور متضاد رائے رکھنے والے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو صحیح معنوں میں ”مغرب زدہ“ ہے اور عورت کو ہر اعتبار سے مردوں کے برابر اور انہیں کی ذہنی اور اخلاقی صفات سے متصف خیال کرتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں انہیں صنفِ قویٰ کے دوش بدوش دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے مخصوص سماجی ماحول سے اس حد تک متاثر ہو گیا ہے کہ تعلیم نسوان کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا۔ فاضل مصنف نے اس افراط و تفریط سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ وہ موخر الذکر گروہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں اور بہت صحیح کہتے ہیں:—

”عورتوں پر دور ماضی کا بہت بڑا اثر پڑا ہے اور اس نے عورت کو اپنے مناسب حال اخلاق اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اب نسل بعد نسل یہ مصدوعی اخلاق اس کے اندر راسخ ہو گئے ہیں ”تربیت“ اور انتخابِ جنسی نے ان کو اور بھی نہایاں کر دیا ہے۔ تربیت کے ذریعہ سے لڑکی کو ان اوصاف کا خوگر کیا جاتا ہے جو اس کے لئے پسندیدہ خیال کئے جاتے ہیں..... اور انتخابِ جنسی کے ذریعہ سے ان اوصاف کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے جو مرد کو خوش نہا معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ مرد صرف اس لڑکی سے شادی کرتا ہے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔ اس لئے نسل بعد نسل یہ خواص مورثی بنتے چلے جاتے ہیں“—

.....

”عورت کے اندر اس قسم کی مخفی قوتیں موجود ہیں جو اس کی حالت کو بہتر بنا سکتی ہیں اس پر

ایک طویل مدت تک مظالم کئے گئے ہیں.....
مقتضائے انصاف نہیں ہے کہ اب بھی ہم اس پر
جابرانہ حکومت کریں۔

—————:0:—————

اول الذکر گروہ سے فاضل مصنف کا خطاب یہ ہے:—
”تربیت سے زیادہ خود نسوانیت عورت کی ذات
پر اثر قاللے والی چیز ہے.....“
”اور یہی نسوانیت حقیقی اور اساسی موثر ہے“

.....

”ایک محدود حد تک عورت کو لازمی طور پر
مرد کی اطاعت کو قبول کرنا پڑے گا اور اگر اس
نے اس اطاعت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو نظام
بشری کلیتہً اُلت پلت جائے گا۔ بلکہ اگر کوئی انسان
اس کی کوشش کرے تو خورد عورت کی فطرت۔ اس
کے اعضا کی ساخت۔ اس کا اخلاق اور اس کا مزاج
اس مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرے گا“—

—————:0:—————

ذکورہ بالا اقتباسات سے عورتوں کے متعلق فاضل مصنف کا نقطہ خیال
پورے طور پر معلوم ہو جاتا ہے اور اس میں اضافہ یا کمی کی کوئی گنجائش
باقی نہیں ہے۔ اگر ہمارے پر جوش جدید تعلیم یافتہ نوجوان یہ سمجھ لیں
کہ با وصف مساوات ذہنیت عورت اپنا ایک مخصوص نظام ترکیبی بھی رکھتی
ہے یعنی ”نسائیت“ تو وہ یورپ اور امریکہ کی کورانہ تقلید چھوڑ دیں۔
دوسری طرف اگر ہمارے ملک کے قدامت پسند حضرات اس حقیقت پر غور
کریں کہ عورت کی موجودہ حالت۔ اس کی کمزوریاں۔ اس کی مکتسب عاداتیں
یہ سب کے سب اس میں ماحول کے اثرات یا بقول فاضل پروفیسر ”انتخاب جنسی“
(Sexual Selection) کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور انہیں بدلنا ممکن ہے تو
وہ عورت کو حقیر خیال کرنا چھوڑ دیں۔ اس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کریں
اور اسے اس کے مناسب حال رتبہ پر ضرور سرفراز کریں۔

—————:0:—————

کتاب میں عورت کی نفسیاتی خصوصیات مثلاً غیرت۔ کلیر الکلامی۔

جذبہ راست بازی۔ تنگ خیالی۔ تلون مزاجی وغیرہ پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ جو بجائے زمانہ حال کی تحقیق کے زیادہ تر متقدمین کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ مثلاً عورت کی ذہانت اور حافظہ کے جو نقائص فاضل مصنف نے بتائے ہیں ان کی تصدیق تازہ ترین نفسیاتی اختیارات سے نہیں ہوتی۔ کتاب کا طرز فلسفیانہ ہے۔ ترجمہ میں بھی یہی اثر پیدا ہو گیا ہے۔ مناسب ہوتا کہ زیادہ سلیجھا ہوا ترجمہ ہوتا۔ موجودہ ترجمہ بھی بہت بلند پایہ ہے۔

نسوانی مسائل پر غور کرنے والے حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضرور مفید ہوگا۔

کاغذ معمولی لکھائی چھپائی اچھی ایک روپیہ ۸ آنہ میں صوفی پرنٹنگ کمپنی پنتی بہاء الدین سے مل سکتی ہے۔

(و)



شالامار باغ

یہ سو صفحات کی کتاب مولوی محمد الدین صاحب فوق لاہوری کی تالیف ہے۔ جس میں موصوف نے نہایت تلاش و جستجو سے ہندوستان کے اُس مشہور آفاق تاریخی باغ کے حالات تاریخی لکھے ہیں جو لاہور میں شالامار کے نام سے معروف۔ مرحوم شاہجہاں بادشاہ کے شوق تعمیر کی دلفریب یادگار اور آج بھی باوجود اپنی بربادیوں کے نادرۂ روزگار ہے۔ جناب فوق بہت سی تاریخی کتابوں کے مواف ہیں اور آپ کے تالیفات کو ماک میں پوری مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ یہ رسالہ بھی بارہا ارباب ذوق کے ہاتھوں تک پہنچ چکا ہے۔ مگر اس جدید اشاعت میں مولف صاحب نے بہت کچھ مزید تاریخی معلومات کا اضافہ کیا ہے اور اب یہ باغ شالامار کی ایک عہدہ اور مکمل تاریخ ہو گیا ہے۔ مزید دل چسپی کے لئے لایق مواف صاحب نے یہ کیا ہے کہ کشمیر۔ پنجاب۔ ہندوستان میں اور جتنے باغ اس نام کے ہیں ان کے حالات بھی بہم پہونچا کر شامل کر دئے ہیں۔

چھوٹے سائز پر معمولی چھپی ہے اور آتھہ آنہ میں ظفر برادر س تاجران کتب لاہور سے ملتی ہے۔

(م)



تاریخ و سیرت



ترجمہ تزک بابری اُردو معروفہ بابو نامہ

یہ کتاب بابر بادشاہ کے خود لکھے ہوئے سوانح زندگی کا اُردو ترجمہ ہے جو شاہزادہ مرزا نصیر الدین حیدر گورگانی المخلص بہ فانی مرحوم و مغفور نے فارسی ترجمہ سے سائیس اُردو زبان میں کیا ہے۔ مترجم نے اسے ۱۸ جہادی الاول سنہ ۱۳۱۶ ہجری کو قیام حیدر آباد کے زمانہ میں ختم کیا لیکن طبع ہونے کی نوبت اُن کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۲۳ ہجری میں آئی حضرت مترجم انارالد برہانہ کی محنت شاقہ اور اُن کی صاحبزادی خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ سلمہا اللہ الرحمن کی توجہ کاملہ کا یہ نتیجہ ہے جو یہ بے نظیر کتاب نہایت شیریں با محاورہ اُردو زبان میں زیور طبع سے آراستہ نظر آتی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ تقریباً یورپ کے ہر زبان میں ہو گیا ہے اور یہ بڑی صدمہ کی بات تھی اور بڑی کمی تھی کہ اُردو زبان اس دولت سے محروم تھی۔ اس لئے صاحبزادی صاحبہ کا جہاں تک شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کہ انہوں نے اپنے والد ماجد مرحوم و مغفور کے یادگار ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ اُردو داں پبلک پر ہوا احسان کیا۔

جناب شاہزادہ مرزا نصیر الدین حیدر مرحوم جیسا کہ مقدمہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے ترکی زبان سے واقف تھے اور ایک ترکستانی عالم سید محمد آفندی سے حاصل کی تھی۔ یہ اُردو ترجمہ گو عبدالرحیم خاں خانخانی کے فارسی ترجمہ سے کیا گیا ہے مگر اُس فارسی ترجمہ میں اس قدر ترکی الفاظ ہیں کہ جب تک قدیم ترکی زبان سے واقفیت نہ ہو فارسی سے بھی ترجمہ کرنا دشوار ہے چنانچہ جن لوگوں نے یورپ کی زبانوں میں فارسی سے ترجمہ کیا ہے وہ بھی ایک گونہ ترکی زبان سے واقفیت رکھتے تھے۔ اُردو میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کا مقابلہ جان لیڈن صاحب کے ترجمہ سے بھی کیا گیا ہے۔ جان لیڈن صاحب کے ترجمہ کے متعلق ذیل کے سطور میں کچھ ذکر کیا جائے گا۔ خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ اپنی مقدمہ کتاب میں تحریر فرماتی ہیں کہ ”ابتداءً تو اس کام میں حضرت کے ایک انگریزی خواں دوست نے اپنا وقت عزیز صرف کیا اور جب وہ نبھا

تہ سکے تو میوے برادر مرحوم مرزا قہرالدین حیدر جو اُس وقت زندہ تھے اور راقمہ نے باوجود اپنی کم لیاقتی کے اپنی خدمات نذر کیں پھر برادر مرحوم کو بھی خدمات مفوضہ سرکاری کے سبب سے فرصت نہ ملی لیکن راقمہ نے یہ مبارک خدمت بفضل الہی آخر تک انجام دی، واقعی اس ترجمہ میں صاحبزادی صاحبہ (سلہا اللہ تعالیٰ) نے جو کد و کارش فرمائی ہے اور حسن اسلوب کے ساتھ جو انتظام طبع فرمایا ہے وہ ہم سب کے شکریہ کا مستحق ہے۔ جو کام اس وقت تک بڑے بڑے مردوں سے نہ ہو سکا وہ ان لایق بی بی نے انجام دیا۔ کاتب حروف کے پاس سوائے تعریف و عقیدت مندی کے ان کے لئے کوئی الفاظ نہیں خدائے بزرگ و برتر اُنہیں بہت دنوں سلامت رکھے! اور ایسے بہت سے کام اُن کے ہاتھ سے کرائے! یہ بی بی مردوں سے گوے سبقت لے آئیں اور قوم کے لئے باعث فخر ہیں۔

بابر نامہ کے اس وقت تک آتھہ قسم کے نسخے دنیا کی نظر سے گذرے ہیں

جنکی تفصیل مسز بیورج نے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں حسب ذیل دی ہے:—

۱- بابر کا اپنا قلمی نسخہ سنہ ۱۵۳۰ع میں لکھا گیا اس میں کچھ اوپر ۳۸۲ صفحے تھے سنہ ۱۶۲۸ع سے ۱۶۳۸ع تک شاہی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے اس کے بند غائب ہو گیا۔

۲- خواجہ کلاں احراری کا نسخہ۔ یہ سنہ ۱۵۲۹ع میں لکھا گیا تقریباً ۳۶۳ صفحے تھے۔ جس سال مکمل ہوا اسی سال سہرورد بھیجا گیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ کلاں کے خاندان میں اب تک محفوظ ہے۔

۳- ہمایوں کا نسخہ جس پر اس کے حکم سے حاشیہ چڑھایا گیا تھا۔ غالباً اس کی تکمیل سنہ ۱۵۳۱ع میں ہوئی اس کا لکھنے والا شاید علی الکاتب تھا سنہ ۱۵۵۶ع سے ۱۵۶۷ع تک شاہی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے۔

۴- محمد حیدر و غلات کا نسخہ۔ یہ سنہ ۱۵۳۶ع و سنہ ۱۵۳۰ع کے درمیان لکھا گیا ہے ممکن ہے کہ خود محمد حیدر مولف تاریخ رشیدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ سنہ ۱۵۳۰ع و سنہ ۱۵۳۷ع میں کشمیر میں اس کا پتہ چلا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اب کاشغر میں ہے۔

۵- الفسٹن صاحب کا نسخہ۔ اس کی تاریخ کتابت ماہین سنہ ۱۵۵۶ع و سنہ ۱۵۷۶ع ہے اس میں تقریباً (۲۸۶) صفحے تھے۔ کتب خانہ ادووکیت (Advocates' library) میں سنہ ۱۸۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۱ع تک پتہ تھا۔ سنہ ۱۸۱۰ء و

میں بمقام پیشاور یہ خریدا گیا تھا۔

۶۔ برٹش میوزیم کا نسخہ۔ سنہ ۱۶۲۹ ع میں تحریر ہوا ہے۔ اس میں صرت (۹۷) ورق ہیں۔ سب پرزے پرزے ہیں۔ علی الکشمیری اس کا کاتب تھا۔

۷۔ نسخہ لنڈیسیانا۔ نور محمد خواہر زادہ ابوالفضل نے اسے سنہ ۱۶۲۵ ع میں لکھا تھا۔ اس کے صرت (۷۱) ورق دستیاب ہوئے ہیں جو اب جان ریلنڈ (John Ryland) کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

۸۔ حیدرآبادی نسخہ۔ غالباً سنہ ۱۷۰۰ ع کا قلمی ہے اس میں ۳۸۲ صفحے ہیں۔ مسز۔ اے بیورج Mrs. A.S. Beveridge نے اسے ایقت کیا اور سنہ ۱۹۰۵ ع میں مسٹر گب ترست (Gibb Trust) نے فوٹو لے کر شایع کیا۔ یہ نسخہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔ مسز بیورج کی نظر سے بمقام حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۰۰ ع میں گُزرا تھا اور سید علی بلگرامی مرحوم کی کوششوں سے مسز بیورج کو دستیاب ہوا جنہوں نے (۱۸) سال کی محنت میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مفصل حاشیے چڑھا کر شایع کیا۔

فارسی میں بابر نامہ کا پہلا ترجمہ سنہ ۱۵۸۳ ع میں پانڈہ حسین مغول غزنوی اور محمد قلی مغول حصاری نے کیا تھا۔ دوسرا فارسی ترجمہ سنہ ۱۵۸۹ ع میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے محمد عبدالرحیم خاں نغاناں ترکمان نے کیا۔ ان دونوں نے اپنے ترجموں کا نام واقعات بابری رکھا۔ مسٹر لیڈن اور مسٹر ارکن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا مگر فارسی ترجمہ سے کیا۔ اصل ترکی سے نہیں کیا اصل ترکی سے بابر نامہ کا ترجمہ صرت مسز اینت۔ ایس بیورج Mrs. Annette S. Beveridge نے کیا ہے جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ ان تینوں ترجموں میں باہم بہت اختلاف ہے جن پر تفصیلی بحث کرنا یہاں مقصود نہیں صرت معہواں سا ذکر کیا جائے گا۔ یہ اردو ترجمہ بابر نامہ جو اس وقت زیر تنقید ہے عبدالرحیم خاں خاننجان کے فارسی ترجمہ کا ترجمہ ہے اور لیڈن صاحب کے ترجمہ سے مقابلہ کر کے درست کیا گیا ہے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ فارسی ترجمہ شہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کے پاس کہاں سے آیا۔ کاتب حروت کے پاس جو نسخہ ہے وہ مرزا محمد شیرازی مالک الکتاب بھٹی کا طبع کردہ ہے جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ”کتب مذکور از کتب خانہ عالی جاہ راجہ مہاروپا دیایا سانول داس جی مہر کونسل راج اوڈے پور مرا بدست آمد لہذا بہ ترسیم آن رغبت گماشت

و حتی الامکان بہ تصحیح آن کرشید۔ اماچوں تصحیح این قبیل کتاب کہ منحصر بہ نسخہ واحد و اکثر الفاظ ترکی دارد چنانچہ باید بفعل نمی آید۔۔۔ یہ صحیح ہے واقعی اس نسخے میں بکثرت غلطیاں موجود ہیں۔ میرزا نصیر الدین حیدر مرحوم کے اردو ترجمہ کا اس فارسی ترجمہ سے سرسری مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اردو ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ رواں ہے مثلاً۔

صفحہ ۱ سطر ۱۴ میں ہے ”از بکوں کے حملے سے اس زمانہ میں ایسی ویرانی ہے“ (اردو ترجمہ)۔ فارسی ترجمہ یہ ہے ”از جہت عبور اوزبک در این تاریخ ویران شدہ“۔ ترکی الفاظ یہ ہیں ”مغل و ازبک جہت دیں“ یعنی مغلوں اور ازبکوں کی وجہ سے۔ مسز بیورج لکھتی ہیں کہ الفاظ ”از جہت عبور اوزبک“ خانخاناں کے بڑھائے ہوئے ہیں جن سے صرت صراحت مقصود تھی اس لئے کہ الہالیخ و الہاتو اور یانگی یہ تینوں شہر مشرق و مغرب کے راستہ پر جہاں سے خانہ بدوش اقوام آیا کرتی تھیں واقع تھے۔ ترجمہ میں اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جو ”عبور“ کا لفظ بڑھایا گیا۔ ارسکن اور لیڈن نے اس کا ترجمہ ”از جہت حملہ ہائے اوزبک“ کیا ہے جو نہ ترکی کا صحیح ترجمہ ہے اور نہ اس میں وہ رعایت ہے جو وضاحت کے خیال سے خانخاناں نے رکھی تھی۔ اسی انگریزی ترجمہ لیڈن صاحب کا ترجمہ شہزادہ صاحب کا اردو ترجمہ ہے۔

صفحہ ۵ سطر ۱ ”اس کو تاریخ کی کتابوں میں اخشیکت کے نام سے لکھا ہے“ فارسی ترجمہ میں ہے ”در کتب اخشیکت می نویسند“ اصل ترکی میں ہے ”کتابوں میں اسے اخشیکت لکھتے ہیں“

صفحہ ۵ سطر ۳-۶ ”دریائے سیحون قلعہ کے فصیل کے نیچے ہتی بہتا ہے۔ اس کا قلعہ ایک اونچے کھد پر بنا ہوا ہے جو دریا کے کنارے پر ہے۔ کھد کی گہرائی گویا قلعہ کی خندق ہے۔ عمر شیخ مرزا نے جب اس کو دارالسلطنت بنایا تو دو ایک مرتبے باہر کی جانب اور پشتے تعمیر کئے“ یہ ترجمہ اس فارسی کا ہے ”دریائے سیحون از پایہ قلعہ امیریزد۔ و قلعہ او بر جرباندی واقع شدہ۔ بجائے خندق جرہائے عمیق افتادہ عمر شیخ مرزا کہ آن را پایے تخت ساخت یکدو مرتبہ از بیرون ہم باز جرہا انداخت“ مسز بیورج نے جو ترجمہ کیا ہے اس کی اردو یہ ہے۔ ”فصیل سے گھرے ہوئے شہر کے نیچے دریائے سیحون بہتا ہے۔ یہ قرفان (یعنی محصورہ بستی اور قلعہ سب) ایک بڑے کھد (درہ) پر واقع ہے اور خندق کے جگہ اس میں گہرے گہرے درے ہیں۔ عمر شیخ مرزا نے جب اسے اپنا پایا

تخت بنایا تو دو ایک مرتبہ بیرونی درون میں سے (چند) اور درے کاٹے “
 اسپر مسز بیورج نے ایک بڑا فوت دیا ہے جو بہت دلچسپ ہے مگر طوالت کے
 خیال سے یہاں نہیں درج کیا جاتا۔ انکا مقصود یہ ہے کہ عمر شیخ مرزا نے پانی کے لئے
 نہرین کات کر نکالی تھیں جنہیں اسی شہر اخشی کے مشرق و مغرب میں باہم
 لاکر ملا دیا تھا تا کہ شہر کی حفاظت کا کام بھی اُن سے لیا جاسکے اور شہر میں
 زیادہ پانی بھی پہنچایا جاسکے۔ بابر دو لفظ انگ انگ استعمال کرتا ہے قرغان
 اور ارک۔ قرغان سے مراد ہے وہ شہر جس کے گرد فصیل ہر معہ اندرونی قلعہ کے
 جسے ارک کہتے ہیں۔ خانخاناں نے اور انکے اتباع میں مرزا نصیر الدین حیدر
 مرحوم نے قرغان اور ارک دونوں کا ترجمہ قلعہ ہی کیا ہے اور جو فرق انکے
 معنوں میں ہے اسے نظر میں نہیں رکھا۔

صفحہ ۵ سطر ۱۲ ” بارہ سلگھا “ ترجمہ کیا گیا ہے بوغو مرال کا جس کے اصلی
 معنی گوزن کے ہیں۔ حیدر آبادی ترکی نسخہ میں اس لفظ کے نیچے معنی کے
 طور پر گوزن کا لفظ لکھا ہوا ہے اور واقعات بابری میں بھی اس کا ترجمہ گوزن
 کیا گیا ہے۔ لیکن خانخاناں کا جو فارسی ترجمہ ہمارے سامنے ہے اس میں صرف
 بوغو مرال ہی لکھا ہوا ہے۔

صفحہ ۸ سطر ۵ و ۶ ” معجون بہت کھانے لگے تھے۔ معجون کھانے کے بعد
 مزاج چراندہا ہر جاتا تھا۔ رحمدل بہت تھے۔ بغل اور داغ بہت رکھتے تھے “ یہ
 ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ہے مترجم نے ذرت میں بعض الفاظ کے نہ سمجھنے کا
 اعتراف کیا ہے۔ فارسی ترجمہ کی اصل عبارت یہ ہے ” در آخر معجون بسیار
 اختیار میکرد و در معجون گری کلد خشک می شد۔ متیم شعار بود و نعل داغ
 بسیار داشت “ مسز بیورج کے ترجمہ کی اُردو یہ ہے ” آخر زمانہ میں معجون کو
 ترجیح دیتے تھے اور اس کے ترنگ میں بیغود رکھتے تھے۔ عاشق مزاج تھے
 اور محبت کے داغ (دل پر) بہت رکھتے تھے “ اس معنی کے سند میں مسز بیورج
 نے نظامی کا یہ مصرعہ پیش کیا ہے۔

ہنوز از عشق بازی گرم داغ هست

صفحہ ۱۲ سطر ۱۱ ” جنگ یاسی کجیت میں گھسان کی لڑائی لڑا تھا بھاگڑ
 اور مصیبت کے موقعہ پر جب میں نے کوہستان مسیحا سے سلطان محمود خان
 پاس جانے کا ارادہ کیا “ فارسی ترجمہ ہے ” واز جنگ یاسی کجیت ہم خوب
 چاقو بولاں کردہ بود۔ در قزاقیہا وقتے کہ در کوہستان مسیحا عزیمت رفتن پیش
 سلطان محمود خان کردم “ چاقو بولاں سے مراد باہم شمشیر زنی کرنا ہے۔ قزاقی

کا لفظ اُن لڑائیوں کے لئے آیا ہے جو تخت چھن جانے کے بعد کپیلنگاہوں میں بیٹھے کر بابر نے لڑی تھیں۔ انہیں انگریزی میں ”گوریلا وارفیر“ کہتے ہیں۔ اُردو ترجمہ سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا جہاں اس لفظ کا ترجمہ ہمیشہ ”مصیبت کے موقعے“ کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۱ سطر ۲۰۔ فارسی کا ایک شعر ہے جس کا آخری لفظ ارزین ہے۔ فارسی نسخہ میں بھی یہی ہے جسے کتابت کی غلطی کہنا چاہئے مگر مسز بیورج ارزین لکھتی ہیں جو صحیح ہے۔ دیباچہ انوار سہیلی میں یہ شعر موجود ہے۔

صفحہ ۱۳ سطر ۱۲-۱۳ ”سنہ ۹۰۸ ہجری میں جب میں نے خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑ لیا اور کابل میں مقیم کو جا کھیرا“ فارسی ترجمہ ہے ”در تاریخ نصد و دہ کہ خسرو شاہ را ہمراہ گرفتہ در کابل مقیم را قبل کردہ بودم“ سنہ کی غلطی ہے فارسی ترجمہ میں سنہ صحیح ہے نام مقیم نہیں ہے بلکہ مقیم ہے ”خسرو شاہ را ہمراہ گرفتہ“ اس فارسی اور اس کے اُردو ترجمہ ”خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑ لیا“ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ فارسی ترجمہ کی تائید کرتا ہے اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے ”سنہ نوسو دس ہجری میں جب کہ خسرو شاہ کے ہمراہ میں نے کابل میں مقیم کو محصور کیا“۔

صفحہ ۱۵ سطر ۵ و ۶ ”اس کا دعویٰ تھا کہ میں جادوگر ہوں“ فارسی ترجمہ ہے ”دعویٰ یدہ چی گری میکرد“ یدہ چی گری کے معنی جادوگری کے نہیں ہیں۔ مسز بیورج نے اس کا ترجمہ Judo-stone سے پانی برسنا کیا ہے۔ اُردو ترجمہ سے یدہ چی گری کی یہ خصوصیت نہیں ظاہر ہوتی اور جادو کا عام مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۱۶ اُردو ترجمہ میں ”سنہ ۸۹۹ ہجری کے واقعات“ یہ الفاظ بطور عنوان درج ہیں۔ فارسی ترجمہ میں ہے ”وقائع سال اول جلوس مطابق سنہ ۸۹۹ ہجری“۔ مسز بیورج نے کوئی ایسا عنوان نہیں قائم کیا۔ ترکی نسخہ میں صرف تسلسل واقعات ہے سال جلوس اول کی صراحت کر کے واقعات درج نہیں کئے ہیں مگر اس میں کوئی ہرج نہیں۔ فارسی ترجمہ اور اُردو ترجمہ کے یہ اختلافات کتاب زیر ریویو کے صرف سولہویں صفحہ تک سرسری طور پر نظر آئے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہر جزو میں کم و بیش اسی قدر ملیں گے۔ مثال کے طور پر بس انہیں کافی سمجھا جائے۔ عیسوی تاریخیں آسانی کے لحاظ سے ہجری سنین کے مطابق اکثر صحیح لکھی گئی ہیں مگر بعض بعض جگہ غالباً سہو

غلطی ہو گئی ہے مثلاً صفحہ ۴۷ کے چوتھے ذوت میں بجائے سنہ ۱۴۹۷ع کے سنہ ۱۴۵۷ع درج ہو گیا ہے۔ یہ یقیناً کاتب کی غلطی ہے مگر ایسی غلطیاں نہ ہونی چاہئیں۔ اصل ترکی نسخہ میں دستبرد زمانہ سے سنہ ۱۹۱۴ھ کے واقعات کا صرف ایک ورق باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد سے سنہ ۹۲۵ ہجری تک کے اوراق ضائع ہو گئے اور کتاب میں نہیں ہیں۔ سنہ ۹۲۵ ہجری سے واقعات کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے لیکن سنہ ۹۲۶ ہجری کے چند ورق کے بعد بہت سے اور ورق غائب ہیں اور سنہ ۹۳۲ ہجری سے پھر سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تمام واقعات اُردو ترجمہ میں (باتباع مطبوعہ ترجمہ فارسی) سنہ ۹۱۵ ہجری اور سنہ ۹۲۷ ہجری کے نیچے درج کئے گئے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اسے تحقیق کر کے لکھنا چاہئے تھا۔ مقامات کے نام نیز اشخاص کے نام کہیں کہیں غلط اور بلا تحقیق و تصحیح لکھ دئے گئے ہیں۔ یہ چیز نہایت اہم اور سخت محنت و جانفشانی کی محتاج ہے۔ صرف دو ایک مقام کی مثال یہاں دی جاتی ہے ورنہ پوری کتاب سے انتخاب کرنا ایک غلط نامہ تیار کرنے کے برابر ہے۔

صفحہ ۱ اُطوار غلط ہے۔ اس کے جگہ طراز ہونا چاہئے۔ اُطوار مغربی ترکستان میں ہے اور طراز مشرقی ترکستان میں۔ متن میں مشرقی ترکستان کا ذکر ہے اس لئے اس میں اُطوار صحیح نہیں ہو سکتا۔

ایغاچ ایک لفظ ہے جو بارہا اس کتاب میں آیا ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی میں فرسنگ کیا گیا ہے مگر یہ غلط ہے۔ ایغاچ ایک - قررہ فاصلہ کے لئے نہیں آتا اور کم و بیش ہوتا رہتا ہے کہیں فرسنگ کا مراد ہوتا ہے اور کہیں نہیں۔ اس لئے فرسنگ کی جگہ اس لفظ کو ہمیشہ داخل کرنا بے احتیاتی بلکہ غلطی ہے۔ صفحہ ۲۰ پر سلطان احمد مرزا کی ایک بیوی کا نام قبلیق بیگم لکھا ہے جو غلط ہے۔ صحیح لفظ قنات یا قاتاق ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اشارہ کر دیا ہے مگر متن میں صحت نہیں کی۔ صفحہ ۶۶ سطر ۲۱ میں، تو قد بیگ غلط نام ہے۔ صحیح نام تو قا بیگ ہے۔ اسی طرح معہد دوست اور علی دوست دو الگ الگ شخصوں کا مذکور نہیں ہے بلکہ صرف معہد دوست کا ذکر ہے جو علی دوست کا لڑکا ہے۔ صفحہ ۴۴ سطر ۱۸ و ۱۹ میں پل معہد حبیب غلط نام ہے۔ صحیح نام ہے پل معہد چپ۔ غرض کہ اسی طرح کے ناموں میں بکثرت غلطیاں ہیں جو نظر ثانی کی سخت محتاج ہیں۔

باہر نے بعض مقامات پر مثلاً خواجہ مولاناے قاضی ابراہیم سارد۔ کوک سداے وغیرہ کے حالات بطور جہلہ معترضہ سلسلہ واقعات سے الگ کر کے لکھے ہیں۔ فارسی ترجمہ کی کتابت میں ایک سلسلہ میں انہیں درج کر دیا گیا ہے

اور اُردو ترجمہ میں بھی یہی کیا گیا ہے۔ مناسب ہوتا کہ انہیں اس طرح لکھا جاتا کہ سلسلہ یہاں منقطع نہ معلوم ہوتا اور یہ بڑی اپنی جگہ رہتے۔ ترکی اصل کتاب سے اگر مقابلہ کیا جائے تو بعض مقامات پر بہت تقدم و تاخر معلوم ہوگا مثلاً اُردو ترجمہ میں (باتباع فارسی مطبوعہ ترجمہ) صفحہ ۴۴ پر سنہ ۹۰۳ کے واقعات میں سلطان حسین مرزا اور بدیع الزماں مرزا کی لڑائی۔ بدیع الزماں کے ذوالنون کے پاس جانے تک کا حال درج ہے جو حیدرآبادی ترکی نسخہ میں سوخر رکھا گیا ہے اور سنہ ۹۰۲ ہجری کے واقعات میں درج کیا گیا ہے۔ اس طرز اور دو ایک مقام پر یہی حال ہے اور الفاظ میں تو اکثر اختلاف ہے جس کی صراحت طوالت سے خالی نہیں۔ اگر یہ امر تحقیق کر لیا جاتا کہ کس سنہ کے یہ واقعات ہیں اور اُسی سنہ کے تحت میں درج کئے جاتے تو مناسب ہوتا۔

اس اُردو ترجمہ کا جان لیڈن صاحب کے ترجمہ سے مقابلہ بھی ہوا ہے۔ لیڈن صاحب کا ترجمہ خود بالکل ناقص اور تصحیح طلب ہے۔ مسٹر ارسکن کو جب یہ ترجمہ ملا تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ وہ لیڈن صاحب کو بڑی منزلت دیتے ہیں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ”اس ترجمہ کے ماننے نے مجھے عجیب گومگو کی حالت میں ڈال دیا۔ دونوں ترجمے (یعنی خود ان کا اور لیڈن صاحب کا) بہت سے اہم جزئیات میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن چوں کہ ڈاکٹر لیڈن کو اصل نسخہ سے ترجمہ کرنے کا موقع ملا تھا میں نے خیال کیا کہ جہاں تک ہوسکے انہیں کے ترجمہ کو اختیار کروں اور صرف ایسے مقامات تبدیل کرتا جاؤں جو متن سے یا تزک کے دیگر حصص سے صاف طریقہ پر غیر مطابق نظر آئیں یا جو بالکل سہو نظری سے تحریف ہوئے ہوں جو ایک نامکمل کام میں لازمی طور پر واقع ہوا کرتی ہیں۔“ ارسکن کے مقدمہ میں بہت سے ایسے صاف صاف اشارے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر لیڈن کے ترجمہ کو سمجھتے ہیں کہ محض مشق کے طور پر کیا گیا تھا اور اس میں بہت کچھ تصحیح و ترمیم کی ضرورت باقی تھی۔ کاش اس اُردو ترجمہ کا مقابلہ بجائے لیڈن صاحب کے مسز بیورج کے ترجمہ سے کیا جاتا اور جو نوٹ کہ لیڈی صاحبہ نے لکھے ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ کو اس کا علم ہوتا تو وہ ضرور ایسا کرتیں۔

مسز بیورج نے اپنا ترجمہ چار حصہ کر کے جون سنہ ۱۹۱۲ ع مئی سنہ ۱۹۱۳ ع اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ ع اور ستمبر سنہ ۱۹۹۱ ع میں تکررے تکررے کر کے شایع کیا

ہے۔ انہیں مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کی مدد سے ایک ترکی قلمی نسخہ مل گیا تھا۔ جو ان کی تحقیقات میں بابر کے اپنے قلمی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ بابر کے اس نسخہ کو عبدالحمید (مولف پادشاہ نامہ) نے سنہ ۱۶۲۸ ع و سنہ ۱۶۳۸ ع کے مابین شاہ جہاں کے ذاتی کتب خانہ میں دیکھا ہے۔ یہ اب نادر شاہ کے دستبرد اور سنہ ۱۸۵۷ ع کی بغاوت کی بربادی سے خدا معلوم کہاں ضائع ہو گیا ہے۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ جو اس کی نقل ہے اورنگ زیب کے زمانہ (سنہ ۱۶۵۵ ع - سنہ ۱۷۰۷ ع) کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مسز بیورج نے پروفیسر براؤن کو یہ نسخہ دکھایا تھا اور ان کے مشورے کے بعد چھاپا گیا۔ مگر اس میں بھی بہت سے ورق غائب ہیں اور تسلسل بیان میں وقفہ پڑ جاتا ہے۔

محمد حیدر مرزا و غلات کے پاس بھی ایک اصلی نسخہ تھا جس سے وہ تاریخ رشیدی میں بکثرت انتخابات درج کرتا جاتا ہے۔ ان ایام کے حالات معلوم کرنے میں جن کے ورق کم ہو گئے ہیں اس نسخہ سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ اصل ترکی بابر کی اپنی زبان ہے۔ مسز بیورج نے موجود ارسکن اور لیڈن کے ترجموں کے حیدرآبادی ترکی نسخہ سے ترجمہ کرنے کا ارادہ صرف اس لئے کیا کہ وہ لیڈن کے نسخہ کی طرح نامکمل اور خراب نہ تھا اور ارسکن کے ترجمہ کے مقابلہ میں جو فارسی ترجمہ کی مدد سے کیا گیا ہے اصل ترکی سے ترجمہ کرنا اصلیت کو زیادہ قائم رکھتا تھا۔ بابر کے اپنے رنگ اور خصوصیات کا جو اندازہ خود اس کے الفاظ سے ہو سکتا ہے وہ اس کے کلمات کے اونس ترجموں سے نہیں ہو سکتا جو فارسی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ ارسکن کے ترجمہ میں یہ بات مفقود ہے اور لیڈن کے ترجمہ میں جو بالکل نامکمل اور ناقص ہے بدرجہ اولیٰ مفقود ہے۔ پھر اُس ترجمہ میں یہ کیسے نظر آسکتی ہے جو با معاوہ رواں اردو زبان میں فارسی ترجمہ سے کیا جائے اور ایک ناقص ترجمہ سے مقابلہ کر کے صحیح کیا جائے۔ یہ ضروری بات ہے کہ بابر بابر نظر آئے نہ کہ اکبر شاہ ثانی یا بہادر شاہ۔

اس اردو ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان نہایت شستہ اور طرزِ ادب دلچسپ اور مسلسل ہے کہیں الجھن نہیں ہوتی اور گو خانہ خاناں کے ترجمہ کی طرح اصل ترکی زبان کے انداز و ترکیب عبارت کے مطابق نہیں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ایک بہت مشکل چیز کو حتی المقدور واضح اور سلیس زبان میں اداس کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مترجم علیہ الرحمہ کو اس میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔

مسز بیورج اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں لکھتی ہیں کہ خود ان کے ترجمہ

ارسکی کے ترجمہ اور تی کورٹیل کے الفاظ و انداز میں بابر کی شخصیت تین مختلف طرح کی معلوم ہوتی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ ہر ایک نے مختلف نسخوں سے ترجمہ کیا ہے لیکن بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ قزاق اہل قلم نے اپنی بے تکلف رواں افگریزی اور فرانسیسی زبانوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ ان کی تصویر بلا شک زیادہ صحیح ہوتی اگر ان میں سے ہر ایک اپنے مادری زبان کے استعمال کو صرف ان اجزا تک محدود رکھتا جو ترکیب السنہ کے لحاظ سے پرانی ترکی کے لگ بھگ ہوتی —

یہی حال اردو ترجمہ کا ہے جو بابر ترکی زبان میں نظر آتا ہے۔ اردو زبان میں نہیں ہے۔ وہ ”ہم“ کا لفظ اکثر صرف اس وقت استعمال کرتا ہے جبکہ خود اس کی ذات کے ساتھ اس کے اُمرائے دولت و ملازمین سے بھی مراد لینا مقصود ہو ورنہ شرماتا ہے۔ کہیں افعال مجہول استعمال کر کے اپنا صریحی ذکر بچا جاتا ہے اور کہیں جمع متکلم استعمال کر کے دوسرے لوگوں کی آڑ میں خود حجاب کے مارے پوشیدہ رہتا ہے۔ اس کے بچپن کی اُمنگ۔ شوخ و شنگ طبیعت۔ پھر درازی عمر کے ساتھ پختگی کا آنا اور باوجود بے تکلفی کے متانت یہ سب باتیں اس کی اپنی زبان کے مختلف موقعوں کی عبارتوں ہی سے ظاہر ہوسکتی ہیں۔ بے تکلف اردو معاوروں کا آزادانہ استعمال اسے کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے اور بعض دفعہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو اصل ترکی کتاب میں ہے۔ میرے خیال میں اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ بہت کچھ لفظی کیا جائے اور حتی المقدور ترکی زبان کے خصوصیات یا کم سے کم جو قیود کہ بعض ترجموں میں ان خصوصیات کو محفوظ رکھنے کیلئے رکھے گئے ہیں انکی پابندی ملحوظ رہے خواہ زبان کسی قدر اوپری ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ اس سے آدمی کی صحیح طبیعت کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا لیکن اگر دوسری زبان کے معاورات کو بلا تکلف برتا جائے گا تو اس بات کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔ بابر نامہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف کی تصویر کی تھیک جھلک نظر آئے اور معلوم ہو کہ جو شخص بات چیت کر رہا ہے وہ کون ہے اور کیسا ہے۔ اگر یہ بات ترجمہ میں نہ رہی تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے تصویر کے خطوطال کو بدل دیا ہے اور بابر کی ترکی اور ہندی تصویر میں بڑا فرق پڑ جائے گا۔ عبدالرحیم خان نے فارسی زبان میں اس خصوصیت کو بہت حد تک باقی رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ترکی الفاظ استعمال کرتا ہے کہ کچھ تو صحیح تصویر کا رنگ و روغن باقی رہے۔ مثلاً صفحہ ۶۴ سطر ۲۲ و ۲۳ اردو ترجمہ کی یہ عبارت ہے ”جو نہی

میں نے یہ سنا کہ اندجان والے میرے طرفدار ہیں وونہی میں نے کچھہ کامل نہ کیا۔ سورج نکلتے ہی میں مرغیان سے چل نکلا اور دن تھلے اندجان میں آگیا۔ اس ترجمہ کی اصل فارسی عبارت یہ ہے ”خبر مضبوط ساختن اندجان بمن آمد ہیچ توقف نہ کردہ در وقت آفتاب برآمد از مرغیان سوار شد روز برگشتہ بود کہ باندجان آمد“ مسز بیوج کے انگریزی ترجمہ کی اردو یہ ہے ”جونہی میں نے یہ سنا کہ اندجان کو ان لوگوں کی مدافعت میں مضبوط کر لیا گیا ہے سورج نکلتے ہی میں مرغیان سے گھوڑے پر سوار ہوا اور دوپہر کے قریب اندجان جا پہونچا۔

ایک اور مثال لیجئے۔ اردو ترجمہ کے صفحہ ۶۵ سطر ۱۲ و ۱۳ پر ہے ”یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمارے اور خواجہ قاضی کے متعلقہ قوتوں کو لڑتا اور تباہ کیا تھا“ خانخانا کی فارسی یہ ہے ”درین فترات ہا فلان و تاراج کنندہ مردے کہ بما تعلق داشتند و متعلقان خواجہ قاضی ہمیں ہا بودند“ مسز بیوج کے انگریزی ترجمہ کی اردو یہ ہے ”یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے زمانہ ہائے فترت میں خود میرے اور خواجہ کے متعدد مسلمان متعلقین کو لڑتا اور قید کیا تھا“ فترت کے زمانہ سے وہ زمانہ مراد ہے جس میں بابر بے تاج و تخت تھا اور مسلمان کا لفظ جرم کی اہمیت ظاہر کرنے کو لکھتا ہے۔ ان ترجموں کا باہمی فرق ظاہر ہے۔ میرے خیال میں مترجم کا یہ بڑا فرض ہے کہ تصویر کے اصل خطوطال جسقدر ہوسکے باقی رکھنے کی کوشش کرے گو یہ بہت مشکل ہے مگر کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوسکتی ہے۔

بابر نامہ کے جس قدر نسخے دستیاب ہوئے ہیں سب افسوس ہے کہ نامکمل ہیں یعنی بیچ بیچ میں سے اوراق غائب ہیں جن سے سلسلہ بیان میں بار بار وقفے پڑ پڑ گئے ہیں۔ اردو ترجمہ میں اس کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ واقعات کی آڑی کو جو قوت قوت گئی ہے جو ردیا جائے۔ فارسی ترجموں میں بھی یہ کمی موجود ہے۔ جب تک ہم عصر مورخین کی تصنیفات کو اُت پات نہ کیا جائے واقعات کا علم ہونا اور چھوٹے ہوئے مقامات پر ربط قائم کرنا بہت مشکل اسر ہے اصل کتاب کے ورقوں کے ضائع ہونے کے بہت سے وجوہ بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سنہ ۱۵۱۲ع میں حصار کے قریب شاہی کیمپ برباد ہو گیا اُس میں بھی کچھہ ورق ضائع ہوئے کچھہ سنہ ۱۵۲۹ع میں ضائع ہوئے۔ اس موقع پر کتابوں کو نقصان پہونچنے کا ذکر خود بابر کرتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمایوں کو سنہ ۱۴۳۱ع سے سنہ ۱۵۵۰ع تک جلا وطن رہنا پڑا۔ اس زمانہ میں

اس کے کتب خانہ پر کیا کیا آفتیں گذری ہوں گی۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ بابر نے اپنے بعد مکمل کتاب چھوڑی اور باوجود نقصانات کے پھر بھی اس کی تکمیل کر دی تھی۔ یہ پوری کتاب اس کے بعد تک موجود تھی مگر مہایوں کی جلا وطنی نے ہر چیز کو تہ و بالا کر دیا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کتاب کو بہت نقصان پہونچا۔ عبدالرحیم خان خانانوں کو بھی مکمل کتاب نہیں ملی اس لئے ان کے ترجمہ میں بھی ضائع شدہ اوراق کی جگہ خالی رہ گئی ہے۔ انہوں نے تکمیل کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ ان کا جو مقصود تھا یعنی آئین اکبری کے لئے ابوالفضل کو مواد بہم پہونچانا وہ پورا ہو گیا تھا۔

مسز بیورج نے اس طرط خاص ترجمہ کر کے تمام واقعات کا سلسلہ ملا دیا ہے کیا اچھا ہوتا اگر مرزا نصیر الدین حیدر صاحب مرحوم یا ان کی صاحبزادی صاحبہ بھی اس کمی کو پورا کر دیتیں۔ میرے خیال میں اس کمی کے پورا کرنے کی بہت ضرورت ہے تاکہ تاریخ کی یہ کتاب مکمل ہو جائے۔ نیز اس کی ضرورت ہے کہ مقامات کے نام اور لوگوں کے نام کی صحت کافی طور پر کی جائے اور ان کے تھوڑے تھوڑے حالات بھی لکھ دئے جائیں۔ تاہم جو کچھ ہو گیا ہے وہی بہت غنیمت ہے اور ہمارے توقع سے بہت زیادہ ہے۔

(عبداللہ)



تاریخ بنی ہاشم

تاریخ اسلام میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کی باہمی نزاعت ایک طویل کشمکش ہے جو مہلکت اسلام کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوئی۔ اس قبائلی مغاصمت و جد و جہد کے متعلق مختلف العقائد فرقوں کی مختلف رائیں ہیں اور اس کے متعلق بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں چنانچہ یہ کتاب بھی ان میں سے ایک ہے۔ دوسری تاریخوں کے مقابلے میں ایک چیز جو اس میں بہتر پائی جاتی ہے وہ مولف کی ذاتی رائے ہے۔ فاضل مولف نے جس واقعہ کو لیا ہے بہ حد امکان اس پر استدلال کیا ہے اور جو کچھ کہا ہے صحت صحت کہا ہے لیکن کتاب پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فی الحقیقت حسرت علی کی سوانح صبری ہے۔

تاریخ بنو ہاشم میں سب سے زیادہ اہمیت آنحضرت صلم کو حاصل ہے جنہوں نے دنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیم کامیابی

اور دیگر سوانح کو صرف اکتالیس صفحوں پر بیان کیا ہے اور حضرت علی کا بیان ایک سو پینتالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مولف کے لئے ایک راے کا رکھنا ضروری ہے لیکن اس راے کے اظہار میں غم و غصہ مولف کے شایان شان نہیں۔ اُس کتاب کی تاریخی حیثیت قائم نہیں رہتی جس کے واقعات کا اظہار نہایت درشت پیراے میں کیا جائے۔ ہم بہ خیال اختصار صرف چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۲۳ ”ابولہب کی زرجہ ایک بد عقل و کمینہ عورت تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس بیوی اور اسی سالے کی وجہ سے ابولہب فی النار ہوا۔“

صفحہ ۳۵ ”ابودجانہ نے چاہا ہے کہ اس دائیں گائیں کا سر آڑا دیں۔“

صفحہ ۱۸۰ ”دیدہ حاسد کور باد اس پر کمینہ خوجہلای قریش“

صفحہ ۱۹۳ ”افسوس کہ یہ روش مذموم علامہ مہدوح (مولوی شبلی نعمانی) سے مختص نہیں ہے بلکہ ہم ایک گروہ کو اسی خط میں مبتلا دیکھتے ہیں۔“

ذرا مقابہ کیجئے۔

صفحہ ۱۳۶ ”عدی نے اس لاش (طرفہ) کو گاڑا۔“

صفحہ ۱۳۶ ”اس جنگ میں اصحاب امیر المومنین کی طرف سے صرف سات مجاہد شہید ہوئے۔“

اس کے علاوہ مختلف مقامات پر بدکار۔ ناہنجار۔ ظالم۔ سفاک۔ بد خصات اور دوسرے ایسے بہت سے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس سے مولف کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

مولف نے جو واقعات درج کئے ہیں ان میں کہیں کہیں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔

صفحہ ۹۵ ”اور فرمایا کہ کل ہم یہاں سے روانہ ہونگے۔ ہمارے ساتھ کوئی وہ شخص نہ چلے جس نے عہد عثمان میں اہل شورش کی حمایت کی ہو۔“

صفحہ ۱۴۰ حضرت علی محمد ابن ابوبکر کے متعلق فرماتے ہیں ”بخدا میرے علم میں محمد ان لوگوں میں سے تھا جو قضائے الہی کے منتظر رہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں حصول اجر کے لئے کرتے ہیں اور مومن

سے مافوس اور فاجر سے بیزار رہتے ہیں۔“

سب سے قابل اعتراض وہ دعویٰ ہے جو فاضل مولف نے قریہ فدک کے متعلق کیا ہے اور اس پر زیادہ تکلیف دہ وہ حق جو زید ابن علی کے متعلق دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۶۳ ”آنحضرت کے مہلوقات و مقبوضات خاص تھے جو مالک المہلک حقیقی نے بلا مداخلت و کوشش مجاہدین کے آنحضرت کو عطا فرمائے تھے۔“

صفحہ ۲۳۷ ”ہم ’سلطنت رسول خدا‘ کے لئے سب سے زیادہ حقدار تھے۔“
کسی بانی مذہب کا اپنے لئے مقبوضات و مہلوقات رکھنا بے معنی ہے اور اس سے زیادہ ناقابل قبول وہ خیال ہے جو ”سلطنت رسول خدا“ کے متعلق ہے۔ ایک سیاسی فلسفی کے زاویہ نگاہ سے یہ دونوں دعوے بے معنی ہیں۔

مولف نے کئی جگہ بغیر دلیل کے علل قائم کئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
صفحہ ۶۲ ”لیکن حضرت عمر کے آخری دور سلطنت میں آثار زوال نمودار ہو گئے۔“

مبالغہ دیکھئے۔

صفحہ ۱۳۶ ”جنگ صفین“ ان میں سے صرف آخری روز کی جنگ میں پانچ سو تیس شامی امیر المومنین کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔“

صفحہ ۱۸۸ ”زیاد جب تک امیر المومنین علیہ السلام کی طرف سے حاکم ایران رہا نوشیرواں بنا رہا اور جب معاویہ سے سازش کر کے ان کے عہد میں حکمران ہوا تو چنگیز خاں سے بھی خونریزی میں بڑھ گیا۔“
ان کے علاوہ اور متعدد واقعات ہیں جو صرف اختصار کے خیال سے درج نہیں کئے جاتے۔

ایک مورخ کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ سلیس زبان لکھے۔ کیوں کہ غیر معروضات ترکیبوں کے استعمال کرنے سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً

صفحہ ۱۹۸ ”روژ باز پرس کو دھیان رکھے ہوئے وہ کام کئے جو اس وقت کام آئیں۔“

ان تمام خامیوں کے باوجود مولف کی یہ محنت مستحق تعریف ہے اور اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ الجھا ہوا زمانہ معرض بحث میں آئے گا۔ تاریخ میں اگر تحقیق سے کام نہ لیا جائے تو تاریخ کی حیثیت افسانے کی رہ جاتی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

فاضل مولف میرے خیال میں پہلے اُردو تاریخ نویس ہیں جنہوں نے کھلم کھلا واقعات پر استدال کیا ہے۔

(۱)



سیرت عمر و ابن العاص

اس کتاب میں حضرت عمر و ابن العاص کے سوانح زندگی بیان کئے گئے ہیں ابتدا میں آنحضرت سے مخالفت-نجاشی کے پاس وفد لے کر جانا اور آخر میں خالد ابن ولید کے ساتھ مل کر مشرت بہ اسلام ہونا یہ سب واقعات وضاحت سے درج ہیں۔ مولف نے ان کے اوصاف بالخصوص شجاعت و تدبر کو بہت اہمیت دی ہے۔ شجاعت میں انہیں خالد ابن ولید کے ہم پلہ کیا ہے اور تدبر و فراست کے نقطہ نگاہ سے انہیں خالد پر ترجیح دی ہے۔ ہم ان کی شجاعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن کوئی حربیات کا ماہر ان کی فتوحات کو خالد کی ظفرمندیوں کے مقابلہ میں نہیں رکھ سکتا۔ خالد ابن ولید کی اکثر کامیابیاں عربوں کے خلاف ہیں جن میں طرفین مساوی ہیں۔ جنگ احد میں قریش کی کامیابی۔ خلیفہ اول کے زمانے میں مرتد عربی قبائل کو مطیع بنانا۔ ایرانیوں کے خلاف سلاسل اور ولاجہ شام میں فتح یرموک سب خالد کی سپہ سالاری کا نتیجہ تھیں۔ عمر و ابن العاص کی فتوحات اُس وقت کی ہیں جب عربوں کے پاس آلات جنگ و دیگر ذرائع اور جنگی تجربہ پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ اس کے ماسوا ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ معزولی کے بعد خالد ابن ولید کو کوئی موقع نہ ملا ورنہ فاتح مصر غالباً خالد ہی ہوتے۔ جنگ صفین میں تو عمر و ابن العاص کی جرنیلی کا بھرم کھل گیا۔ عمر و ابن العاص دوسرے درجے کے سپہ سالاروں میں ہیں اور ان کا مرتبہ سعد اور قعقاع کے برابر ہے۔

مولف نے حزم و تدبیر میں ان کو حضرت عمرؓ اور امیر معاویہ کے دوش بدوش رکھا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا مطمح نظر جداگانہ ہے یعنی مہلکت اسلام کا استحکام اور حکومت میں عہومیہ کی حیثیت قائم رکھنا۔ عمر و ابن العاص اور امیر معاویہ کا مطمح نظر ذاتی اور جماعتی مفاد ہے۔ حضرت عمرؓ نے ذرائع کہیں بھی ناجائز نہیں لیکن عمر و ابن العاص اور امیر معاویہ دونوں ذرائع اختیار کرنے میں اسلام کے دستور کے خلاف کام

کر جاتے ہیں۔ یہ اختلاف ان خطوط سے ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت عمر نے بصیثیت خلیفہ اور عمر و ابن العاص نے بہ حیثیت امیر مصر ایک دوسرے کو لکھے۔
(صفحہ ۶۳-۶۴-۶۵) حضرت عمر نے یہ تحریر کیا ”کہ سمجھ لو کہ میں کوئی ناقابلِ سماعت عذر قبول نہ کروں گا۔ اگر تم نے تھپک کام کیا ہے تو برأت حاصل کرنے میں کیا قباحت ہے“ عمر و ابن العاص نے جواب میں یہ لکھا ”آپ نے اس مکتوب میں ذرا بھی میرا پاس اور آبرو کا لحاظ نہ رکھا۔ یثرب کا کوئی یہودی بیبی ہوتا تو اس سے زیادہ آپ اُسے کیا لکھتے۔“

تصفیہ دومتہ الجندل میں مولف نے مسعودی کا ساتھ دیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ کوئی زبانی فیصلہ نہ سنایا گیا مگر اس تحریر میں جو مولف نے کتاب میں درج کی ہے فیصلے کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔ تحریر میں عمرو ابن العاص کے متعلق اخیر میں یہ لکھا گیا ہے کہ وہ دونوں کے عزل پر راضی ہو گئے لیکن عبداللہ کی خلافت پر راضی نہ ہوئے۔ اس وجہ سے بلا اس فیصلے کے کہ کون خلیفہ ہو صحیفہ ختم کر دیا گیا۔ اگر اس تحریری فیصلے پر اکتفا کیا جاتا تو عمر و ابن العاص اس فیصلے کو لے کر امیر معاویہ کے پاس کیونکر جاتے اور امیر ان کو چھ ہزار سپاہ دے کر مصر کی امارت کیوں تفویض کرتے اور اس فیصلے کے بعد امیر معاویہ امیر المومنین کا لقب کیوں اختیار کرتے۔

مولف نے عمر و ابن العاص کی خانگی زندگی پر نہایت سرسری نظر ڈالی ہے حالانکہ یہ زندگی بیزا جزو ہے بالخصوص قرونِ اولیٰ میں خانگی زندگی سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ مولف نے عمر و ابن العاص کے خطوط درج نئے ہیں مگر ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ البتہ اس خط کے متعلق گبن و بٹلر کی رائے ظاہر کی ہے جو مصر کی شادابی کے متعلق لکھا گیا ہے فاضل مولف نے خود صرت ترجمہ کر دیا ہے اور بلاغت کے متعلق اتنا بھی تو نہیں لکھا جتنا گبن یا بٹلر نے لکھا ہے۔

مجموعی حیثیت سے مولف کی یہ ترتیب قابلِ تعریف ہے۔ زبان شستہ اور تاریخی مضمون کے مناسب ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ تاریخی الجھنوں سے بالکل پاک ہے۔ اس زمانہ میں ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔



کشمیر کی رانیاں

یہ کشمیر کی بیس رانیوں کا چھوٹا سا تذکرہ ہے جو مولوی محمد الدین صاحب فوق کے اصرار و فرمایش دوستانہ پر محمد اسماعیل صاحب ہاتف بھوپالی نے کشمیر کی تاریخوں سے انتخاب کر کے تالیف کیا اور ظفر برادر لاهور نے شایع کیا ہے۔ کشمیر کی طویل تاریخ میں جس کی مدت تقریباً پانچ ہزار سال ہے صرف بیس رانیوں کے حالات زندگی ضحاً ملتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف صاحب کو کتنی ورق گردانی کرنی پڑی ہوگی کہ یہ چالیس صفحہ کا تذکرہ احاطہ تحریر میں آیا۔ جناب ہاتف نے اس کی ترتیب میں بڑے سلیقہ سے کام لے کر حشو و زوائد اور خلل عقل واقعات کو قلم انداز کر دیا ہے اور تاریخی نقطہ نظر کو پیش رکھ کر یہ رسالہ تیار کیا ہے اس لحاظ سے جناب مولف کی محنت لائق داد ہے۔

کتاب چھوٹے ۲۰ × ۳۰/۱۶ سائز پر چھپی ہے لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ظفر برادر لاهور تاجران کتب ظفر منزل لاهور۔

(م)

سیرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

ہندوستان کے علماء اور عربی داں طبقہ میں شاید کوئی ایسا نہ ہوگا جو علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام اور ان کی گرانہا یہ تصانیف سے آشنا نہ ہو۔ منطق فلسفہ۔ نحو۔ تفسیر۔ عقائد وغیرہ کی معرکہ آرا کتب پر مولانا کے شروح و حواشی اور بعض مستقل تالیفات نہایت بے بہا ہیں۔ درس نظامیہ کے طلباء کو اب تک ان سے کچھ نہ کچھ کام پڑتا رہتا ہے۔ مولانا علوم قدیمہ عربیہ میں مسلم اور فاضل سیالکوٹی۔ فاضل لاهوری کے نام سے مشہور تھے۔ عہد اکبری سے لے کر دور شاہجہانی تک کے مشاہیر علماء و فضلاء میں شمار رہا۔ ان کی فلسفی نکتہ آفرینیاں اور مذہبی مباحث وسط ایشیا و ایران تک کے حکماء کو معروضہ حیرت کیا کرتی تھیں۔ ان کے دم سے سیالکوٹ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری اور علم و فضل کا دریا رواں تھا اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہجہاں کا نامور وزیر بادشاہ سعد اللہ خاں ان کے ہم سبق رہے ہیں

باوجود ان تمام صفات و شہرت غیر فانی کے مولانا کے حالات و سوانح ہنوز پردہ خفا میں تھے۔ مولوی محمد الدین صاحب فوق نے جذبہ وطنی سے کام لے کر اس زبردست عالم کی سوانح عہری تیار کی۔ جس میں تفصیل سے حالات و واقعات بہم پہنچانے کی کوشش کی اور مولانا محمود علی خاں ایم اے پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے مولانا کی بعض مشہور تصانیف پر حق تنقید و تبصرہ ادا کیا ہے۔ شروع میں حضرت اقبال نے جو مولانا کے نامور ہم وطن ہیں مختصر دیباچہ زیب قلم کیا ہے۔ آخر میں مشاہیر سیالکوٹ کے تذکرے اور سیالکوٹ کی مختصر تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں یہ شہر عام و فضل اور صنعت و حرفت کا مشہور گہوارہ تھا۔ یہ کتاب مجموعی حیثیت سے دل چسپ اور تاریخی حالات و واقعات کی حامل ہے اور سوا سو صفحوں پر ختم ہوتی ہے۔ البتہ بعض واقعات مکرر سہ کر آگئے ہیں اور زبان میں کہیں کہیں ”پنجابیت“ نمایاں ہے نام بھی نہایت طولانی اور بے تہنگا ہے۔ یعنی (سوانح عمر مالک العلماء علامہ عبدالعظیم سیالکوٹی) اُمید ہے کہ مولف صاحب آئندہ طباعت میں ان دونوں عیوب کو نکال دیں گے۔

لکھائی چھپائی صاف اور کاغذ معمولی ہے سائز ۱۸ × ۲۲/۸ قیمت دس آنہ ظفر برادر س تاجران کتب لاہور سے ملتی ہے۔

(۲)

اخلاق و تعلیم

درس حیات

یہ کتاب محمد اکبر صاحب مراد پوری (ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول دسرہ ضلع لائل پور) کی تالیف ہے کتاب مختلف اخلاقی مضامین کا مجموعہ ہے اور بقول جناب مولف کے اس کا منشاء یہ ہے کہ اخلاقی مضامین اور ”مشاہیر کی سوانح عہریوں سے نوجوانوں کے جذبات و حسیات ابھارنے کی کوشش“ کی جائے۔ اس مقصد کو مد نظر رکھ کر ۱۸ مضامین ”کیپرکٹر“ مصائب کے فوائد ”مشکلات کا مقابلہ“ ”فراست“ ”خود ضبطی“ وغیرہ پر لکھ گئے ہیں۔ انگریزی اخلاقی کتب سے حسب ضرورت مدد لی گئی ہے اور ان کے اقتباسات درج کئے گئے ہیں۔

دیباچہ میں فاضل مولف موجودہ کتب اخلاقیات کی شکایت کرتے ہیں کہ ”وہ صرف نظریات پراکتفا کرتے ہیں“ ہمیں افسوس ہے کہ باوجود مثالوں کی فراوانی کے یہ کتاب بھی نظری (Theoretical) ہی ہے۔ اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے۔ اخلاقیات کی ہر کتاب جو بالواسطہ اخلاقی نصاب کے عوض ”یہ کرو“ اور ”یہ نہ کرو“ کا دفتر ہوگی ضرور نظری ہوگی۔ اخلاقی تعلیم کے فواید سے افکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس تعلیم کا جو طریقہ پرانے زمانہ میں رائج تھا وہ ضرور قابل اعتراض ہے۔ تجربیدی مباحث اُس وقت تک فوجوانوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اخلاقی قصص اور افسانوں کی شکل اختیار نہ کریں۔

کتاب انگریزی اخلاقی تصانیف - Archetetics of fate, Uses of Life وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ اردو کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ زبان پر کسی قدر پنجابی اثر غالب ہے۔ پھر بھی سادہ اور صاف ہے۔ اسلوب تحریر ناصحانہ ہے۔ اچھی اچھی باتیں لکھی گئی ہیں اور فوجوان اسے سمجھ کر پڑھ سکے اس کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگی۔

تقطیع چھوٹی۔ خط جلی اور واضح۔ اچھی چھپی ہے اور جناب مولف سے دور پیہ میں مل سکتی ہے۔

(و)

تربیت - حصہ اول و دوم

مالیگاؤ ضلع فاک میں ایک چھوٹا سا مقام ہے ریلوے اسٹیشن بھی نہیں لیکن اس دور افتادہ مقام میں اردو زبان کا جو چرچا ہے وہ بہت غنیمت ہے۔ کثرت سے غزل گو شاعر موجود ہیں جن میں سے کئی ایک صاحب تلامذہ بھی ہیں شاعرے بھی ہوتے ہیں گلدستے بھی نکلتے ہیں۔ اس کی بعض ادبی انجمنیں بھی ہیں۔ ان میں ایک دائرہ ادبیہ بھی ہے۔ جس کے ناظم مولوی عبدالحمید صاحب نعمانی صاحب ذوق شخص معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے حال میں اس دایرہ سے تربیت حصہ اول اور تربیت حصہ دوم دو مختصر رسالے شایع کئے ہیں پہلا حصہ مصرکی فاسور اور مشہورہ آفاق ادبیہ آنسہ زینب می کے ایک مختصر رسالہ کا ترجمہ ہے۔ جو موصوفہ نے مصر کے سرکاری مدارس میں لڑکیوں کی ابتدائی

تعلیم کیلئے تصنیف کیا تھا۔ اُس میں آنسو می نے مصری معاشرت کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کو بہت ہی آسان طریقے سے مذہبی و اخلاقی تعلیم دی ہے۔ لیکن چونکہ مصری اور ہندوستانی معاشرت متحد نہیں ہے اس لئے مترجم صاحب نے ترجمہ میں اپنی ملک کی ضروریات و داعیات کے لحاظ سے جا بجا کمی بیشی بھی کی ہے اب یہ رسالہ اس قابل ہو گیا ہے کہ ہندوستانی بچوں کو پڑھایا جائے دوسرا حصہ اگرچہ ترجمہ نہیں بلکہ خود مولوی عبدالعہد صاحب کی تالیف ہے۔ مگر اُسے بھی پہلے حصے کی طرز پر لکھا ہے۔

چھوٹی تقطیع پر پہلا رسالہ ۳۱ اور دوسرا ۳۶ صفحہ پر ہے قیمت دو دو آنے۔

(۲)

ساربان - امانت - نور ہدایت

یہ تینوں قصے بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ پہلا قصہ جس کا نام ساربان ہے حضرت عمر کے عہد کا ہے۔ یہ ایک شخص کی سچائی کا حیرت انگیز امتحان ہے۔ دوسرا قصہ جس کا عنوان امانت ہے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کا ہے۔ اس میں ایک سوداگر نے امانت میں خیانت کی ہے اور خلیفہ کے دربار میں عجیب طرح سے اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔ نور ہدایت میں ایک صحابی کی شہادت کا موقعہ مذکور ہے۔ یہ تینوں اخلاقی قصے ہیں اور اچھی اور صاف ستھری عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ لڑکوں لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ چکنے کاغذ پر بہت اچھے چھپے ہیں۔ جہاں گیر کلب۔ چابک سواران لاہور سے مل سکتے ہیں۔ پہلے کی قیمت چار آنے دوسرے کی آڑھائی آنے اور تیسرے کی تین آنے ہے۔

مذہب

ذکرِ علی

یہ ۳۸ صفحوں کا رسالہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دو مضمونوں۔ تذکار مقدس (ماہ ربیع الاول) اور افسانہ ہجرو وصال کا مجموعہ ہے۔ جسے شرکت

ادبیہ علی گڑھ نے نہایت اہتمام سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نفیس اور حسین و جمیل کتابت و طباعت کے ساتھ خوبصورت سائز میں مجلد شایع کیا ہے اور یہ شرکت کے سلسلہ معارف اسلام کا دوسرا نمبر ہے۔

مولانا کا خطیبانہ پر زور طرز بیان اور خاص دل آویز انداز تحریر کسی معرفی کے محتاج نہیں ہیں اور جس قدر بیان و زبان اور قلم و تحریر میں زور و طنطنہ ہے اُسی قدر اہم مسائل دینی میں ژرف نگاہی بھی حاصل ہے۔ یہ دونوں خوبیاں مل کر مضامین و رسائل میں جو آپ کے قلم سے نکلتے ہیں ایک خاص بات پیدا کر دیتی ہیں جو مولانا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ یہ مجموعہ بھی ان محاسن کا حامل ہے۔

پہلے مضمون میں ولادت با سعادت کی ضرورت و مقصد کو بیان کیا ہے۔ قرآن شریف کی آیات کو جا بجا اپنے مضامین میں جس طرح مولانا سمو لیتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہو گیا ہے۔ دنیا کی فلاح و اصلاح کے لئے خداے پاک کا طریقہ جاریہ (سنۃ اللہ) روحانی تربیت۔ تکمیل ہدایت۔ عالم گیر پیام ظہور و مقصد ظہور۔ یادگار حریت وغیرہ عنوانوں کے ذیل میں بعثت و ضرورت بعثت نبوی کو دل نشین و پراثر پیرایہ میں ثابت و واضح کیا ہے اور دیگر اولوالعزم رسل سے موازنہ و مقابلہ بھی ہو گیا ہے۔

دوسرا مضمون افسانۂ ہجر و وصال ہے جس میں ہماری انتہائی غفلت و سرشاری۔ اسباب ہلاکت۔ حوادث حاضرہ۔ راہ نجات۔ خدا سے سرکشی کا نتیجہ وغیرہ عنوانات کے ذیل میں ماتِ اسلامیہ کے عروج و زوال۔ تباہی و بربادی کا نقشہ کھینچ کر ہوشیاری و بیداری تعلیم نہایت موثر پیرایہ میں دی ہے۔ قیمت کہیں درج نہیں۔ شرکت ادبیہ علی گڑھ کے علاوہ انجمن ترقی اُردو اور فنک آباد دکن سے بھی یہ رسالہ ملتا ہے۔

(۲)

بشری

یہ ۳۸ صفحات کا چھوٹا سا رسالہ مولانا سید سلیمان ندوی کی قیمتی تالیف اور زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں اسلام کے بعض حقائق اور خصوصیات نیز اُن صفات باری تعالیٰ پر روشنی ڈالی ہے جو اسلام نے اپنے پیروں کے

آگے گناے اور پیش کئے ہیں۔ یہ دراصل عیسائیوں کے ایک مشہور اعتراض کا زبردست و مدلل جواب ہے کہ —

اسلام نے خدا کا جو تغیل اپنے پیروں کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ (خدا) ایک جبار-قہار-پر غضب-صاحب جلال و جبروت شاہنشاہ ہے۔ جس سے بندوں کو ترے کافیتے رہنا چاہئے۔ مولانا نے نہایت عمدگی سے اس کا رد کیا ہے اور قرآن حکیم و احادیث صحیحہ سے ثبوت دیا ہے کہ اسلام اُمید و بیم خوف و رجا کے بین بین ہے —

شرکت ادیبہ علی گڑھ نے بسلسلہ معارف اسلام شایع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس و پاکیزہ اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت چھہ آنہ ملنے کا پتہ شرکت ادیبہ علی گڑھ یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کن —

(۲)

—————: 0 :—————

متفرق



خیابان عرفان

اس کتاب کو دیکھتے ہی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اور مطالعہ کے بعد اس سے زیادہ دل و دماغ میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ مستند فارسی شعرا کی رباعیات کا انتخاب ہے۔ جس میں کم و بیش اساتذہ کی پندرہ سو رباعیاں ہیں۔ انتخاب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی صدر محاسب سرکار عالی کا ہے۔ جن کا ذوق ظاہری اور باطنی دونوں قابل داد ہیں۔ ذوق ظاہری کتاب کی نفیس جلد۔ عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ سے ظاہر ہے۔ اور ذوق باطنی اس انتخاب سے جو انہوں نے بڑی کاوش اور کوشش سے کیا ہے۔ سید صاحب موصوف متعدد کتابوں کے مترجم اور مؤلف ہیں اور اپنی ہر کتاب میں انہوں نے نفاست مذاق کا ثبوت دیا ہے۔ یہ رباعیاں خاص خاص عنوانوں کے تحت میں جمع کی گئی ہیں۔ جو معرفت و اخلاق پر مشتمل ہیں۔ ہر صفحہ پر خوشنما بیل ہے۔ لوح بہت خوبصورت ہے۔ جلد پر ایک خوشنما منظر کی تصویر ہے۔ اور کتاب کے اندر ایسے ایسے جواہرات بکھرے ہوئے ہیں جس کی داد صرف اہل بصیرت

دے سکتے ہیں۔ اصحاب ذوق کے لئے یہ بے بہا تحفہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کی پوری پوری قدر کی جائے گی۔

ہماری رائے میں یہ مناسب ہوتا کہ اگر شعرا کے قام کے ساتھ اُن کا مختصر سا حال چند سطروں میں اور سند وفات وغیرہ بھی دے دیا جاتا۔ سہواً چند قطعات بھی درج ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے ادیشن میں نہ صرف اصلاح ہوگی بلکہ اور اضافہ بھی ہوگا۔ یہ بھی کم خوشی کی بات نہیں ہے کہ کتاب نواب عہاد الملک بہادر جیسے صاحب فضل و ذوق کے نام معذوں کی گئی ہے۔ تعداد صفحات پانسو سے اوپر ہے قیمت چھ روپیہ کلدار ہے اور فاضل مرتب سے مل سکتی ہے۔

مصروف جنگلات و تربیت جنگلات

یہ دو کتابیں مولوی ابویوسف احمد معی الدین حسین صاحب فاروقی مددگار ناظم جنگلات ریاست حیدرآباد نے انگریزی سے ترجمہ کی ہیں۔ اُردو زبان میں اس فن کی غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں جو شایع ہوئی ہیں۔ قابل مترجم نے اس کام کو بڑی محنت اور صرف کثیر کے بعد انجام دیا ہے۔ کیوں کہ دونوں کتابیں بہت ضخیم ہیں۔ اس قسم کے فزون کا ترجمہ آسان کام نہیں۔ ان میں سینکڑوں اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن کے مراد الفاظ کا تلاش کرنا بہت دقت طلب ہے۔ ترجمہ سلیس زبان میں کیا گیا ہے اور اصطلاحات میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سہل الفاظ استعمال کئے جائیں۔ مگر بعض بعض مقامات پر ترجمہ بالکل لفظی ہو گیا ہے جس کے سمجھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے یا بعض جگہ ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو کسی قدر ثقیل ہیں اور اُن کی جگہ آسان الفاظ آسکتے تھے۔ لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں کہ اس سے مترجم کی محنت یا کتاب کی خوبی پر حرج آسکے۔ یہ کتابیں خاص طور پر ملازمین سررشتہ جنگلات سرکار عالی کے فائدے کے لئے لکھی گئی ہیں اس لئے اس میں ایسے الفاظ بھی نظر آئیں گے جو حیدرآباد میں رائج ہیں اور دوسرے صوبوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے آسانی سے سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مثلاً نات۔ مندا وغیرہ۔

دونوں کتابوں کے آخر میں درختوں کے مقامی اور انگریزی اور

لاطینی نام اور اُن کے مقابل ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نام درج ہیں۔

قابل مترجم کی محنت اور شوق قابل تعریف ہے اور ہمیں امید ہے کہ جن صاحبوں کے لئے یہ کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں وہ اس کی قدر کریں گے اور خاطر خواہ مستفید ہوں گے۔

—:O:—

سالانہ رپوت - دارالعلومات مودی کامتی۔

یہ دارالعلومات جو انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) کی شاخ ہے بہت مفید کام کر رہا ہے۔ اس کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اُردو زبان کی عمدہ اور منتخب کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ لوگوں میں مطالعہ کا ذوق اور خیالات میں روشنی پیدا کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ کتاب خانوں کا قیام ہے۔ اس رپوت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قابل فاضل محمد طالب الدین صاحب اور ان کے احباب دارالعلومات کی ترقی دینے میں ہر قسم کی کوشش کر رہے ہیں۔ کتاب خانے کے ساتھ اخبارات و رسائل کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ایسی مجلسوں کے انعقاد کا بھی انتظام کیا جاتا ہے جن میں مفید مباحث پر تقریریں ہوتی ہیں۔ ایک رسالہ جاری کرنے کی بھی تجویز ہو رہی ہے اور سب سے بڑی تجویز یہ ہے کہ دارالعلومات کے لئے مستقل عمارت تعمیر کی جائے۔ حسابات کی باقاعدہ تنقیح ہوتی ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ترقی کرے اور اپنے فیض سے اہل کامتی کو مستفید کرے۔

—:O:—

روٹداں جلسہ سالانہ منبع الطب لکھنؤ

منبع الطب کا یہ جلسہ آنریبل راجہ راجیش بلی صاحب بی۔ اے۔ او۔ بی۔ ایم ایل۔ سی وزیر صیغہ تعلیم کی صدارت میں ہوا۔ اس روٹداں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم محمد ہادی رضا خاں صاحب ماہر لکھنوی کی سعی اور مستعدی سے یہ مدرسہ ترقی کر رہا ہے اور طلبہ حکیم صاحب کی تعلیم سے مستفید ہو کر کامیاب ہو رہے ہیں۔ مدرسہ کی روح رواں خود حکیم صاحب ہیں اور حکیم صاحب کے علم و فضل اور سعی و کوشش سے جو رونق اس مدرسہ

کو حاصل ہے وہ لکھنؤ میں اس وقت کسی مدرسہ کو نہیں۔ اُمید ہے کہ جو صاحب طب یونانی کے قدردان ہیں اس کی ضرور مدد کریں گے۔

—: 0 :—

اُردو کے جدید رسالے

شمع

یہ رسالہ اسی سال جنوری سے نکلنا شروع ہوا ہے اور جنوری اور فروری کے دو پرچے شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر جناب محمد حبیب (آکسن) بیرسٹر ایٹلا-ایم-آر-اے۔ ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جناب حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹلا آگرہ ہیں۔ دونوں صاحب فضیلت۔ صاحب ذوق اور پر جوش فوجوان ہیں۔ یہ قرآن السعدین شاید ہی اُردو کے کسی دوسرے رسالے کو نصیب ہو۔ قابل ایڈیٹروں کی طرح رسالہ بھی ہونہار معلوم ہوتا ہے اور مضامین کی ترتیب اور ذوعیت بتا رہی ہے کہ آگے چل کر نام پیدا کرے گا اور اُردو زبان کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اس سے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ اس رسالہ میں سیاسی مضامین کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ قطع نظر اُن سیاسی مسائل کے جو آئے دن کانفرنسوں۔ کانگرسوں اور کونسلوں میں معرض بحث میں آتے رہتے ہیں اُردو داں طبقہ کو زیادہ تر علمی حیثیت سے سیاسیات کے جاننے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے سوائے ”زمانہ“ کے اُردو کے دوسرے رسالوں میں بہت کم اس قسم کے مضامین شایع ہوتے ہیں۔ پروفیسر حبیب جن کے انگریزی مقالہ کا اُردو ترجمہ مبادی سیاسیات کے عنوان سے شمع کے فروری نمبر میں شایع ہوا ہے اس کام کے خاص طور پر اہل معلوم ہوتے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔ آج کل ہمارے ملک میں ہر کہ وہ سیاست کے کوچے میں گام فرسا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کے تاریخی اور علمی پہلو سے واقف ہیں۔ رسالے اور اخبار زیادہ تر وقتی تحریریں ہوتی ہیں اور سب سے پہلے انہیں ملک کی وقتی ضروریات پر نظر رکھنی چاہئے۔ اگر یہ قابل فوجوان ایڈیٹر اپنے رسالے کی یہ خصوصیت قرار دے لیں کہ اس میں ہر مہینے کم سے کم ایک دو مضمون سیاسیات پر اعلیٰ پایہ کے شایع ہوا کریں گے تو وہ بہت بڑا کام کریں گے اور اُن کا یہ رسالہ

درحقیقت شمع ہدایت کا کام دے گا۔ باقی غزل سرائی کے لئے بہت سے رسالے موجود ہیں اس لئے جعفری صاحب کو زیادہ پریشان خاطر ہونے کی ضرورت نہیں۔ رسالوں کو اپنی فرصت کا مشغہ یا شوق پورا کرنے کا آلہ نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے ذاتی شوق کو توجہ کر ملک کی ضرورت کو پورا کرنا چاہئے۔ یہ وقت ہمارے و ہر مچانے اور ہلنے کے ساتھ ہو جانے کا نہیں ہے۔ یہ بہت نازک زمانہ ہے اس میں مزدوروں۔ محنتیوں اور جفا کشوں کی ضرورت ہے۔ ان الفاظ کے لکھنے کی ہمیں اس لئے جرأت ہوئی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں فوجوانوں میں اس کی صلاحیت اور قابلیت موجود ہے۔

مطبع کی غفلت اور کافی نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے پہلا پرچہ اچھا نہیں چھپا تھا اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ لیکن دوسرا پرچہ اس سے کسی قدر بہتر ہے لیکن اس پرچہ میں ہمیں ”قلاع بازیاں“ ”نفاحت“ ”مبہوط“ کے الفاظ دیکھ کر تعجب ہوا۔ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ ہمارے فوجوان دوست اُردو اسلامیں آسانیاں پیدا کریں گے نہ یہ کہ وہ اُسے اور دشوار بنادیں گے۔ اُمید ہے کہ مضامین اور کاپیوں کے دیکھنے میں صحت کا زیادہ خیال رکھا جائے گا۔

ہمیں اس زمانہ میں جب کہ رنگ برنگ کے رسالے جاری ہو رہے ہیں شمع کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صحیح مقاصد ہی کے ساتھ نہیں مگر صحیح عمل کے ساتھ میدان میں آیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔

میانہ تقطیع پر ۹۶ صفحہ کا حجم ہے قیمت سالانہ چھ روپیہ۔ کاغذ بہت اچھا لگا یا گیا ہے۔ منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ سے مل سکتا ہے۔

—: 0 :—

عند لیب

آج کل کوئی مہینا ایسا خالی جاتا ہو گا کہ نیا رسالہ نہ نکلتا ہو۔ لیکن جب کوئی اچھا رسالہ نظر آتا ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ اردو کا علمی اور ادبی رسالہ خورجہ سے شایع ہوا ہے مگر دلی میں چھپا ہے۔ ادیبتر ہلال احمد زبیری سارہری ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض رسائل کے وجود سے اردو زبان کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے ”مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب مل کر بھی ملک میں صحیح ادبی روح پیدا نہیں کر سکتے“۔ لہذا اس رسالے کے

جاری کرنے کی ضرورت ہوئی اور ہمیں توقع بلکہ یقین ہے کہ فاضل ادیبؒ ضرور ”اس نوزائیدہ لہر کی رو بدن دینے میں“ کامیاب ہوں گے۔ یہ پہلا نمبر ہے۔ دعویٰ بہت بڑا اور ارادہ بہت بلند ہے۔ خدا راس لائے اور کامیابی عطا فرمائے۔ لیکن جو کوشش انہوں نے اس نمبر کے مرتب کرنے میں کی ہے وہ ہر طرح قابل تعریف ہے۔ شروع میں ایک تصویر بھی ہے جس میں برکھارت کا سماں دکھایا ہے۔ مضامین بھی دلچسپ ہیں۔ نظموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ اور تقریباً سب نظمیں عمدہ اور پڑھنے کے لائق ہیں۔ پہلا مضمون ”تحریک اتحاد نورانی“ پر مولانا ظفر علیخان صاحب کا ہے اور ”معزن الآثار“ کے عنوان سے مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کا مضمون اسلامی تعبیر کی تاریخ کے متعلق ہے۔ پروفیسر سید علی احسن صاحب احسن کا مضمون اصلاح اُردو بہت پر لطف ہے۔ ایک فسانہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ رسالہ بحیثیت مجموعی بہت اچھا ہے اور ترقی کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ چھپائی لکھائی کا بھی خاص اہتمام کیا ہے۔ بڑی تقطیع کے ۶۰ صفحہ پر ہے۔ سالانہ قیمت چار روپیہ آتھہ آنہ۔

:0:

کوکب

یہ رسالہ حال ہی میں اترولہ ضلع گوندہ سے جاری ہوا ہے۔ ایسے مقام سے ایک اخلاقی اور ادبی رسالہ کا جاری ہونا بہت غنیمت ہے۔ مختلف قسم کے مضامین اور نظمیں درج ہیں۔ آخر میں کچھ معلومات اور خبریں بھی جمع کر دی ہیں۔ قابل ادیبؒ غلام حیدر خاں صاحب کی محنت اور سعی قابل داد ہے کہ انہوں نے ایسے مقام سے ایسے رسالہ کی اشاعت کی ہمت کی ہے۔ اُمید ہے کہ اس علاقے کے اصحاب اس کی قدر کریں گے۔ سالانہ قیمت مختلف طبقوں کے لوگوں سے مختلف ہے۔ عام پبلک اور طلبہ سے دو روپیہ آتھہ آنہ سالانہ ہے۔

:0:

شادمان

یہ بھی بالکل تازہ رسالہ ہے۔ اسی سال سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ ریاست جے پور سے نکلتا ہے۔ ادیبؒ حکیم نورالحسین صدیقی صاحب ہیں۔

مختلف قسم کے مضامین درج ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر ادبی اور اخلاقی ہیں۔ دو ایک غزلیں بھی ہیں۔ ادبی تفریح اور دل چسپی کے لئے یہ اچھا رسالہ ہے۔ قابل اذیتہر مستحق شکر یہ ہیں کہ انہوں نے جے پور سے اردو کے ادبی رسالہ کے شایع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے ریاست جے پور میں اردو ادب اور زبان کے صحیح ذوق پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ صفحات پر علاوہ سلسلہ کے اعداد کے ہر مضمون کے اعداد الگ الگ لکھے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے لیکن اس سے کیا فائدہ جب کہ مضامین کی طبع میں اس امر کا خیال نہیں رکھا کہ ہر مضمون رسالہ سے الگ نکل سکے۔ ایک ہی صفحہ پر ایک مضمون ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔

رسالہ جے پور کے نابالغ مہاراجہ مان سنگھ کے نام سے منسوب ہے۔ خاصی بڑی تقطیع پر ۶۳ صفحے ہیں۔ کاغذ اچھا لگایا گیا ہے۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے۔

—:01:—

اردوے معلیٰ

مولانا حسرت موہانی نے فی الحال سیاسیات سے قطع تعلق کر کے پھر اردوے معلیٰ شایع کیا ہے اور جنوری اور فروری کے نمبر ایک ساتھ نکالے ہیں۔ اردوے معلیٰ اردو کا پرانا خادم ہے اور اس نے ادبی ذوق پیدا کرنے اور اردو کی اشاعت میں قابل تعریف خدمت کی ہے۔ یہ رسالہ اول سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۱۳ء تک برابر جاری رہا لیکن حکومت کے حکم سے بند کر دیا گیا تھا۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اب وہ پھر جاری ہوا ہے اور اس کی ادبی دلاویزیاں وہی ہیں جو پہلے تھیں۔ بجائے سیاسیات کے اب بزرگان دین کے شجرے شروع میں درج کئے گئے ہیں۔ یہ نئی بات ہے جو پہلے اردوے معلیٰ میں نہیں تھی۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی ایک تصنیف نکات سخن کے نام سے شایع کرنی شروع کی ہے۔ اس کتاب میں متروکات سخن، معائب سخن، معاسن سخن، نوادرات سخن اور اصلاح سخن سے بحث ہوگی۔ چنانچہ اس وقت پہلی فصل جو متروکات سخن کے متعلق ہی شایع ہو رہی ہے۔ یہ مولانا کے مطالعہ اور ادبی ذوق اور تجربہ کا فچور ہے۔ یہ تصنیف بڑے پایہ کی ہوگی اور ادیبوں۔ شاعروں۔ طالب علموں کے لئے بے حد کار آمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اس لئے ہم

اُن صاحبوں کی خدمت میں جو اردو زبان اور ادب کا ذوق رکھتے ہیں دل سے یہ سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور اسے مطالعہ کریں۔ یہ کتاب اُن کے حق میں بڑی نعمت ہوگی۔ مولانا نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا تھا کہ اُن اساتذہ کے کلام کا جو اب تک طبع نہیں ہوا تھا یا جو ایک بار طبع ہو کر گھنام ہو گیا تھا انتخاب شایع کیا تھا۔ ابھی بہت سے اساتذہ باقی تھے۔ ان کا کلام بھی اُردوے معلیٰ میں مسلسل چھپنا شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ صاحبان ذوق اور اُردو زبان کے بھی خواہ اس رسالہ کی قدر کریں گے۔ سالانہ چندہ صرف دو روپیہ چار آنے ہے۔ مولانا سے کانپور کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

—————: O :————

ککے زئی

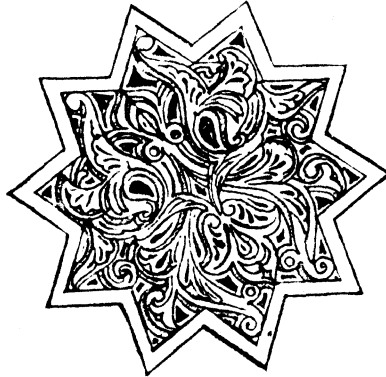
یہ قوم ککے زئی کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس قوم کے لوگ زیادہ تر پنجاب میں آباد ہیں اور اس کے اکثر ارکان تجارت پیشہ ہیں۔ ان کی ایک مجلس ککے زئی سنٹرل ایسوسی ایشن کے نام سے لاہور میں قائم ہے۔ رسالہ کا مقصد قوم ککے زئی میں تعلیمی و معاشرتی اصلاح کرنے کا ہے۔ یہ بہت مبارک مقصد ہے بشرطیکہ یہ حضرات اپنے فرقے کی دھن میں ملک اور قوم کو نہ بھول جائیں۔ فرقہ واری کوششوں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ بڑے مقصد کو بھول جاتے ہیں اور اُن میں ایک قسم کی تنگ دلی اور تنگ نظری پیدا ہو جاتی ہے ہمیں اُمید ہے کہ ککے زئی اپنے فرقے کی اصلاح کے جوش میں ملک کے فرائض کو فراموش نہیں کرے گا اور سلامت روی اور بیش بیلگی سے اپنے فرض کو انجام دے گا۔ جس طرح کوئی شخص تنہا دوسروں سے الگ رہ کر دنیا میں بسر نہیں کر سکتا اور نہ ترقی کر سکتا ہے اسی طرح کوئی فرقہ یا قوم ملک کی دوسری اقوام سے الگ رہ کر عروج حاصل نہیں کر سکتی۔ ککے زئی سے یہ توقع ہے کہ وہ اس خیال کو پیش نظر رکھے گا اور ایسی صورت میں وہ یقیناً اپنے فرقے کے لئے بہت زیادہ مفید ہوگا۔

—————: O :————

جام جہاں نما

یہ نیا رسالہ پانی پت سے مولوی محمد اسماعیل صاحب کی اتیثری میں ماہ مارچ سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ رسالہ بڑے دعوے اور دم خم کے ساتھ

میدانِ ادب میں آیا ہے۔ وہ بعض موجودہ رسالوں پر فقرے کسنے کے بعد اردو کے چند نامور رسالوں کا نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ”بھلا ہماری پہنچ اُن فلک نشینوں تک کہاں ہو سکتی ہے۔ پر لگا کر بھی اُڑیں تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتے“ لیکن اس انکسار اور عجز سے اُسے فوراً ندامت ہوتی ہے اور دوسرے ہی فقرے میں کہہ اُٹھتا ہے ”مگر نہیں ہمیں پہنچنا وہیں ہے۔ مانا کہ اس وقت نہیں پہنچ سکتے۔ دو چار چھ برس میں سہی مگر ہمیں پہنچنا وہیں ہے۔ تکلیفیں اُٹھا کر۔ دقتیں سہہ کر۔ بار بار ناکام رہ کر۔ مگر ہمیں پہنچنا وہیں ہے“ آفرین ہے اس ہمت پر۔ اگر انہیں اپنے نفس پر ایسا ہی اعتماد ہے تو وہ ضرور وہاں تک پہنچ کر رہیں گے۔ اور ہماری آرزو ہے کہ جس مدت کا اندازہ انہوں نے کیا ہے اس سے بھی جلد پہنچیں۔ مولانا حالی مرحوم اور مولانا وحید الدین صاحب سلیم کے ہم وطن کے لئے یہ کوی دشوار بات نہیں ہے۔ رسالہ دلچسپ ہے اور ہر قسم کے مفید معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ادبیات۔ اخلاقیات۔ اسلامیات۔ تذکرات۔ ایجادات۔ معلومات۔ اکتشافات۔ منظومات۔ فکات۔ تفریحات۔ عقلیات۔ نسائیات۔ صناعات۔ معربات۔ استفسارات۔ تعارفات۔ تنقیدات۔ یہاں تک کہ ”مفیدات“ اور فسانے بھی ہیں۔ کیا ہے جو اس جام میں نہیں ہے۔ ۳۲ صفحے میں ساری کاٹنات آگئی ہے۔ گویا قابلِ ادیت نے کوزہ میں سمندر بند کر دیا ہے۔ مگر اس میں پیسہ اخبار کے انتخاب لاجواب کا رنگ نظر آتا ہے۔ سالانہ چندہ صرت تیرہ روپیہ ہے۔ اس قیمت پر یہ رسالہ درحقیقت بہت ارزاں اور لایقِ قدر ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔



مطبوعات انجمن

سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا۔ یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ
کددار۔

تذکرہ شعراے اردو

مولانا میر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کی مثنوی بدر ملہر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے ہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا مصد حبیب الرحمن خاں صاحب سروانی نے ایک بسط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کددار۔

میر مجلد ایک روپیہ ۶ آنہ کددار۔

تاریخ قہدن

سرتامس بکل کی شہرہ آفاق کتاب ۷

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔ جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۳۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کددار
سرگزشت حیات یا آپ بیتی
اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشوونما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس

۱۰۔ آٹھ کلدار۔ مجلد ۱ روپیہ کلدار۔
قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد
اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے
جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم
ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک
کلید بھی تیار کی گئی ہے۔ قاعدہ
غیر مجلد ۲ آٹھ کلدار۔ کلید قاعدہ
غیر مجلد ۳ آٹھ کلدار۔

فلسفۂ تعلیم

غربت اسپنسر کی مشہور تصنیف اور
مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور
و فکر کا بہترین کارنامہ۔ والدین و معلم
کے لئے چراغ ہدایت ہے۔ تربیت کے
توانین کو اس قدر صحت کے ساتھ
مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم
ہوتی ہے۔ اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت
مجلد ۳ روپیہ کلدار۔ غیر مجلد ۲ روپیہ
آٹھ کلدار۔

دریائے لطافت

هندوستان کے مشہور سخن سنچ میر
انشائہ خاں کی تصنیف ہے۔ اردو
صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ
کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے
متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج
ہیں۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ
کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار۔

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل

ترجمہ ہے۔ الف سے ی تک تمدن کے ہر
مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث
کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید
میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے
اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب
اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
حصہ اول غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ
مجلد دو روپیہ کلدار۔ حصہ دوم مجلد
۲ روپیہ کلدار۔

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور
سائنس دان حکیم شکسلی کی کتاب کا
جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔
اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے
لیکن کتاب علم و فضل کا موقع ہے
قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار۔
مجلد دو روپیہ آٹھ کلدار۔

القول الاظهر

انعام ابن مسکویہ کی معرکہ الارا تصنیف
فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب
فلسفۂ الہیں کے اصول پر لکھی گئی ہے
اور مذهب اسلام پر انہیں اصول کو
منطوق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد
آٹھ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار۔

القہر

توانین حرکت و سکون اور نظام شمسی
کی مباحث کے بعد چاند کے متعلق جو
جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو
جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور
کتاب ایک نعمت ہے قیمت غیر مجلد

ہیں۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔
حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ
۸ آنہ کلدار۔

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکمی کا نام علم
و تحقیق و صداقت کا مرادف ہے۔
یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔
معاشرت۔ اصول۔ اخلاق۔ مذاہب
و خیالات کا مرقع ہے۔ حصہ اول مجلد
۲ روپیہ کلدار حصہ دوم مجلد ۲ روپیہ
۸ آنہ کلدار۔

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند
کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان نے لحاظ
سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔ اس کا نقطہ
خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے
کلاس کے طلباء جو یونان قدیم کی تاریخ
سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ
مفید پائیں گے۔ قیمت مجلد ۲ روپیہ
کلدار۔

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعراۓ اردو کے
کلام کا انتخاب ہے۔ مولوی عبدالعق
صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو
نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی
و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں
میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر
۳۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ
بھی لکھا ہے۔ قیمت مجلد ۲ روپیہ
کلدار۔

قلم بند کئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں
انگریزی مصطلحات اور ان کے
مرادفات کی فہرست بھی منسلک
ہے۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار
مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار۔

مشاہیر یونان و روم

ترجمہ ہے۔ سیرت نگاری اور انشا پر دانی
میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس
سے آج تک مسلم الذہن چلا آتا ہے۔
ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس
چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن
پرستی اور بے نفسی عزم و جوان مردی
کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ
معمور ہے۔ قیمت جلد اول غیر مجلد
۳ روپیہ کلدار۔ مجلد ۲ روپیہ کلدار
جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار۔
اسباق المذہب

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین
صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار
کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک
ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت حصہ
اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار حصہ دوم
غیر مجلد ۴ آنہ کلدار۔

علم الہیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر
محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے
ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔
معہشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔
مہم و مشکلی مسائل کو پانی کر دیا ہے
اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب

رسائل نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔ علمی اصطلاحات سے معرا۔ طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار۔

دیباچہ صحت

اس کتاب میں مطالعات صحت پر (مثلاً ہوا۔ پانی۔ غذا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلہیز ہے ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوا۔ حجم ایک ہزار صفحے۔ قیمت مجلد چار روپیہ کلدار۔

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار۔

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ اشعار الشعراء مہر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔ اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملے ہیں جو عام طور پر معروف نہیں۔ نیز مہر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا

مصدق حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار۔

فلسفہ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آدھی کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلسان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار۔

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف ”یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ مہرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں“۔ اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ مخالف و موافق راہوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے۔ سابقوں اور لاحقوں۔ اردو مصادر اور ان کے

کٹی ہے۔ یہ مفسون اردو کے پہلے تسبیح
میں طبع ہوا تھا۔ صاحب نظر قدردانوں
کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے۔
قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار۔

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔
اس میں بعض قدیم اقوام۔ سلطنت
کلدانی۔ آشوری۔ بابل۔ بنی اسرائیل
و فلپیہ کی معاشرت۔ عقائد۔ صنعت
و حرفت و فہرہ کے حالات دلچسپی اور
خوبی کے ساتھ دئے ہیں۔ اردو میں
کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان
قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے
معلوم ہو سکیں اس لئے انجمن نے اسے
خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی
وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی
گئی ہیں۔ صفحہ ۲۷۳۔ قیمت مجلد
دو روپیہ ۶ آنہ کلدار۔

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین
خان صاحب بی اے نے مختلف انگریزی
کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔
برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور
سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے
ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا
چیز ہے۔ کہاں سے آتی ہے۔ کیا کام آسکتی
ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی
ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے۔
قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار۔

مشققات۔ غرض سیکھوں دلچسپ اور
علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔
اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں
ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے
کہ زبان میں ان کی نظر نہیں۔ لیکن
اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط
کردی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند
کردئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اردو کو
علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس
کی آیلدہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے
ہوئے ہچکچاتے تھے۔ مگر اس کتاب کے
ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے
حقیقت کا ایک نیا باب ہمارے آنکھوں
کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات
۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ
کلدار۔

نفع الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین
کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین
کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چیلی
کرنی پڑی ہے۔ علامہ مقری کی نامور
اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی
دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ
کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب
میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت
مجلد چھ روپیہ ۸ آنہ کلدار۔

محاسن کلام غائب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجلوری مرحوم کا
معرکہ الارامی مفسون ہے۔ اردو زبان میں
یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں
(کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں)



۳- تہاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنے

۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی)

۲ روپیہ ۸ آنے

۶- نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ

۷- دہشائے پسران (فارسی) ۱ روپیہ

۸ آنے

۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ

۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنے

(جامعہ ملیہ - علی گڑھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ

۲- الصراط المستقیم ۲ روپیہ

۳- بصائر ۶ آنے

۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنے

۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ

۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنے

۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ

۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ

۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ

۱۰- انتخاب مہر (از نور الرحمن صاحب)

۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ

۱۲- عرض جوہر ۸ آنے

۱۳- مجموعہ کلام جوہر ۶ آنے

۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنے

۱۵- اذہار العرب ۸ آنے

(دارالمصنفین اعظم گڑھ)

۱- سیرۃ النبی حصہ اول ۳ روپیہ

۲- سیرۃ النبی حصہ دوم ۳ روپیہ ۸ آنے

۳- سیرۃ النبی حصہ سوم ۶ روپیہ

۴- شعر المعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ

۵- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ

۶- علم الکلام ۲ روپیہ

۷- الکلام ۲ روپیہ

۸- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنے

۹- اسرار صحابہ مکمل ۵ حصے ۸ روپیہ

۱۰- انقلاب الامم ۲ روپیہ

۱۱- برکے ۱ روپیہ ۸ آنے

۱۲- مکالمات برکے ۱ روپیہ ۸ آنے

۱۳- مثنوی بکسر المحبت ۱۲ آنے

۱۴- تفسیر ابو مسلم اصفہانی (عربی)

۲ روپیہ

۱۵- سیر الصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنے

۱۶- روح الاجتماع ۲ روپیہ

۱۷- ابن رشد ۳ روپیہ

۱۸- گل رعنا ۵ روپیہ

۱۹- سیر الانصار ۳ روپیہ ۸ آنے

(مطبع کاویانی - برلن)

۱- موہن و کربہ (فارسی) ۵ آنے ۶ پائی

۲- زائد المسافرین (فارسی) ۸ روپیہ

۳- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنے

(دائرۂ ادبیہ - لکھنؤ)

- ۱- یادگار غالب ۳ روپیہ
- ۲- مکتب امیر میدانی ۲ روپیہ ۸ آنہ
- ۳- مکتب اکبر ۱ روپیہ
- ۴- میلے سقین ۱ روپیہ
- ۵- حزن اختر ۸ آنہ
- ۶- درس عمل ۳ آنہ
- ۷- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
- ۸- بیگمات بلگال ۶ آنہ
- ۹- اسلام کا اثر یورپ پر ۳ آنہ
- ۱۰- مشرقی ترکستان ۶ آنہ
- ۱۱- سیاحت زمیں ۱ روپیہ
- ۱۲- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الفاظ پر پریس - لکھنؤ

- ۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
- ۲- موازنہ انیس و دہر ۳ روپیہ
- ۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۳ آنہ
- ۴- اصول الدسغ ۶ آنہ
- ۵- مسلمانان اندلس ۱ روپیہ ۸ آنہ
- ۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
- ۷- ہوم دول ۵ آنہ
- ۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
- ۹- مصنوعی شوہر ۲ آنہ
- ۱۰- وکرم اردسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
- ۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۶ آنہ
- ۱۲- الاحسان ۸ آنہ
- ۱۳- ارض نہریں ۳ آنہ
- ۱۴- تذکرۂ حزین ۳ آنہ
- ۱۵- حیات نظامی ۳ آنہ
- ۱۶- خطاب ۴ آنہ

- ۱۶- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
- ۱۷- ترکوں کی کہانیاں ۳ آنہ
- ۱۸- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
- ۱۹- خطبہ حکیم اجمل خان صاحب ۲ آنہ
- ۲۰- ہمارے نبی ۸ آنہ
- ۲۱- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
- ۲۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۱۲ آنہ

(نظامی پریس - بدایون)

- ۱- قاموس المشاہیر جلد اول ۶ روپیہ
- ۲- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
- ۳- دیوان غالب مشرح مجلد ۲ روپیہ
- ۴- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ
- ۵- دیوان درد ۱ روپیہ ۳ آنہ
- ۶- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن) ۱ روپیہ ۸ آنہ
- ۷- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
- ۸- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
- ۹- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
- ۱۰- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
- ۱۱- مرآتی انیس جلد اول مجلد ۱۰ روپیہ
- ۱۲- مرآتی انیس جلد دوم قسم اول ۸ روپیہ قسم دوم ۳ روپیہ
- ۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
- ۱۴- کثر التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

۱۷- مہلہ نبوی	۴ آنہ	۱۲- نظم شبلی	۴ آنہ
۱۸- تصویر درد	۴ آنہ	۱۳- نفس اللغۃ	۱ روپیہ
۱۹- شمع و شاعر	۲ آنہ	۱۴- ترائے شوق	۱ روپیہ ۸ آنہ
۲۰- فریاد امت	۴ آنہ	۱۵- خوبی سخن	۸ آنہ
(دوسری قابل قدر کتابیں)		۱۶- دیگر مسالک میں قطع تعلق	
۱- رسائل شبلی	۱ روپیہ ۸ آنہ	۱۰ آنہ	
۲- کتب خانہ اسکندریہ	۵ آنہ	۱۷- آزادی اسلام	۴ آنہ
۳- مسدس حالی	۱۲ آنہ	۱۸- مصطفیٰ کمال پاشا	۱ روپیہ ۸ آنہ
۴- جنگل کی پہلی کہانی	۵ آنہ	۱۹- گو کہلے کی تقریریں	۱۲ آنہ
۵- بادل کے بچے	۱ روپیہ	۲۰- سلف گورنمنٹ	۶ آنہ
۶- بانگ درا	۴ روپیہ	۲۱- عالم خیال	۸ آنہ
۷- یادگار غالب	۱ روپیہ ۸ آنہ	۲۲- حیات خسرو	۸ آنہ
۸- مجسمہ نظم حالی	۸ آنہ	۲۳- نظام حیات انسانی	۸ آنہ
۹- اکبری اقبال	۳ آنہ	۲۴- فرہنگ فارسی جدید	۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- الفاروق	۳ روپیہ	۲۵- فرہنگ عربی جدید	۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	۸ آنہ	۲۶- اسلامی حکومت	۲ آنہ

—: 0:—

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بے حد انتظار تھا۔ اس میں مہرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے۔ مہر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپیہ کلدار۔ غیر مجلد ۴ روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)۔

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر۔ دلچسپ۔ پراثر معلومات اور بہترین مجموعہ۔ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال ۱ روپیہ۔

الم
افجین ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(کل قیمتیں سکۂ کدار میں ہیں)

(۱۵) الاشاعت پنجاب لاہور کی کتابیں)

اخترا لکسا بہکم	۱ روپیہ ۸ آنہ
دیکھ بھری کہانی	۲ آنہ ۶ پائی
روشک بہکم	۲ روپیہ
رانی کرونا رات	۱ آنہ
رسوم دہلی	۴ آنہ ۶ پائی
ان پورنا دیوی کا ملندر	۱ روپیہ ۸ آنہ
ایام غدر	۱ روپیہ ۴ آنہ
نقش فرنگ	۱ روپیہ ۴ آنہ
پریم پچھسی مکمل	۳ روپیہ
بانگ درا مجلد	۵ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا غیر مجلد	۴ روپیہ
نعمت خانہ	۱ روپیہ ۴ آنہ
خواب راحت	۴ آنہ
چلندن ہار	۲ آنہ
انبول موتی	۱ آنہ ۶ پائی
سوکن کا چلا پا	۶ آنہ
گوہر مقصود	۶ آنہ
لیلیٰ	۲ آنہ
سواد السبیل	۱ روپیہ
سفندان پارس	۱۰ آنہ
قوانین دولت	۴ آنہ
میلنا	۱۲ آنہ
چترا	۱۲ آنہ

نیرنگ ارض

مولفہ مولوی سید راحت حسین	صاحب بی۔ اے
۱ روپیہ ۴ آنہ	سیر المصلفین
مولفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تلہا	دکیل غازی آباد
۲ روپیہ	Hindustani Simplified (اُردو آموز)
ونہش چندر دت صاحب بی۔ اے	۳ روپیہ
Hindustani Simplified شرح	مولفہ ونہش چندر دت صاحب بی۔ اے
۱ روپیہ	رسالہ نماز Prayer Book
خان صاحب عابد علی خان صاحب	۱ روپیہ
ابتدائی تعلیم کی رام کہانی	مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے
۱ روپیہ ۴ آنہ	ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور
۱ روپیہ ۴ آنہ	اُن کی جغرافیائی کیفیت
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے	۶ آنہ
۷ جاندار جو نظر نہیں آتے	مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے
۴ آنہ	

شمع

زیر ادارت

محمد حبیب۔ آکسن بھرسترا ایت لا۔ پروفیسر تاریخ و سیاست مسلم یونیورسٹی

وحسنی عابد جعفری۔ آکسن بھرسترا ایت لا۔ ایڈوکیٹ۔ آگرہ

اردو کا بہترین ماہانہ رسالہ۔ ہرمضمون متحرک خیال اور معلومات

بہترین نمونہ۔ تاریخی۔ سیاسی۔ اقتصادی و ادبی۔ مضامین شایع ہوتے ہیں

نظم۔ تنقید۔ تبصرے۔ قابل دید ہوتے ہیں

ہرماء میں پابندی وقت سے شایع ہوتا ہے

حجم ۱۰۰ صفحے۔ تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا یکساں رفا

تہست سالانہ چھ روپیہ فی پرچہ دس آنہ مع مد

المشیر
منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ

